یونیسکو کوریئر پاکٹ بکس
انسان اور امن

یونیسکو کوریئر پاکٹ بکس

انسان اور امن

انتخاب و تدوین

ایدوارڈو ہارو تیک گلن

(اسپینی ایڈیشن)

ایس ۔ گوپی ناتھن

(انگریزی ایڈیشن)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

(اُردو ترجمہ)

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی

ہمدرد سنٹر ، ناظم آباد ، کراچی ۱۸

طابع دی ٹائمز پریس لیمٹڈ ، کراچی

قیمت : ۱۶ رُپے پے

ترتیب

پیش لفظ

امن کو ایک حالیہ "اختراع" قرار دیا جا سکتا ہے۔ کم از کم مغربی دنیا میں انیسویں صدی تک امن پسند ادب کا کوئی وسیع نشو و نما نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک محض کوئی اِکّا دُکّا مفکّر یا معلّمِ اخلاق جنگ کی آفات کو بیان کرنے کے لیے میدان میں نکلا تھا۔ بہر حال سینکڑوں اور ہزاروں سال سے تنازعات کے تصفیے کے لیے جنگ کو ایک مناسب وسیلہ مانا جاتا تھا۔ جنگ کو مذہبی اور قومی بنیادوں پر شان و شکوہ کا موضوع بنایا جاتا تھا۔ یہ کام اکثر متعصّب اور متشدّد لوگ کرتے تھے اور جنگ اعتدال پسند لوگوں میں بھی کٹر پن اور تعصب پیدا کر دیتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام — جنگ کے بڑے طرف دار اور اس سے اصل نقصان اٹھانے والے — ہمیشہ سے نفرت کرتے چلے آئے ہیں، لیکن اگر عوام سے وحدانی حیثیت میں ایک گروہ مراد لی جائے، جیسا کہ انیسویں صدی میں یہ تصوّر پنپتا رہا، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں کبھی نہ آزادیِ تقریر حاصل ہوئی، نہ آزادیِ عمل بلکہ ان کا کام صرف یہی رہا کہ اپنے آقاؤں کے گونج دار نعروں کو دہراتے رہیں۔

جنگ ہمیشہ سیاست کی رفاقت میں آئی اور دونوں یک جان رہیں۔ ماضی میں بہت سے ملکوں میں جنگ جو طبقات کی حکومت رہی۔ اب بھی بعض ممالک میں یہی کیفیت ہے۔ اگر کلیمنشو عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴) کے دوران میں یہ کہہ سکتا تھا کہ "جنگ اتنا زیادہ سنگین معاملہ ہے کہ اسے فوجیوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا" تو بہت سے فوجی بھی سوچتے چلے آئے ہیں کہ امن اتنا زیادہ نازک مسئلہ ہے کہ اسے

شہریوں کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ فوجی طبقے سے سیاسی طبقے کی علاحدگی اتنی حالیہ بات ہے کہ یہ ابھی مستقل اور واضح سانچے میں نہیں ڈھل سکی ہے۔ بہرحال کسی حد تک ایک توازن پیدا ہو رہا ہے۔ ماضی میں سیاست داں ـــــ جن معنوں میں ہم آج یہ لفظ سمجھتے ہیں، بڑے بڑے جنگی رہنماؤں کے محض مشیر ہوا کرتے تھے اور وہ ایسے طبقات سے تعلق رکھتے تھے جنھیں عام طور پر کم تر سمجھا جاتا تھا مثلاً غلام، غیر ملکی، چھوٹے بیٹے، اور غریب لوگ۔ آج دونوں ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ ایک طرف سیاست داں پہلے سے زیادہ گہرے انداز میں فنِ حرب سے آگاہی حاصل کر رہے ہیں تو دوسری طرف فوجی رہنما سیاست اور معاشرے کا مطالعہ کرنے لگے ہیں۔ اس طرح ہماری صدی میں مخلوط خوبیوں کی حامل شخصیات ابھریں مثلاً چرچل، ڈی گال اور ماؤ سی تنگ۔ خواہ ہم ان شخصیات کے اصول و اعمال کے بارے میں کچھ بھی سوچیں، اتنی بات واضح ہے کہ یہ شخصیات فوج اور سیاست کی عبوری قسم کے صحیح نمونے ہیں۔

انیسویں صدی میں ایک تحریک اٹھی جو بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ یہ کہ جنگ کا وقار ختم ہونے لگا۔ اس وقت تک جنگ کو عظمت حاصل تھی۔ اسے ایک مذہبی اور وطن پرستانہ ضرورت سمجھا جاتا تھا اور کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا کہ یہ "بادشاہوں کا کھیل" ہے۔ کچھ بھی ہو اسے اتنی شرافت افروز چیز قرار دیا جاتا تھا جس میں غیر معمولی قسم کے لوگ حصّہ لیتے تھے۔ یہ تصوّر بھی تھا کہ جنگ میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ادنا ترین انسانوں میں سے بھی ایسے ہی غیر معمولی افراد پیدا کر سکتی ہے۔ (یہاں ہمیں صرف یہ سوچنا ہے کہ بعض خاص فوجی دستوں میں ایسے مفرور اور تارکِ وطن لوگ بھرتی کر لیے جاتے تھے اور محض فوجی بھرتی کی بنا پر ان کے تاریک ماضی کو فراموش کر دیا جاتا تھا بلکہ اس کے بعد معاشرے میں انھیں بڑی قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا)۔ جنگ اپنا وقار اس حد تک کھو بیٹھی ہے کہ اب اس لفظ کے ذکر سے بھی اکثر گریز کیا جاتا ہے۔ موجودہ صدی تک، بلکہ پچھلے چند سالوں تک ہر ملک میں ایک وزارتِ جنگ ہوا کرتی تھی۔ اب یہ عہدہ کہیں بھی باقی نہیں رہا۔ اگرچہ اس سے ملتے جلتے فرائض کی ادائی اب وزارت ہائے دفاع کے سپرد ہو چکی ہے۔ حالیہ زمانوں میں بعض فوجی اقدامات مثلاً الجزائر میں فرانسیسی اقدامات کو قیامِ امن یا امن خواہی کا نام دیا گیا اور امریکا کی مسلح افواج کے جو اڈے اور بارکیں قائم ہیں ان کے باہر یہ نعرہ نمایاں طور پر درج ہے کہ "ہمارا کام امن ہے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی جنگ کے وقار کا زوال ہو گیا ہے اور اب حقیقت لغوی اور لسانی حیلوں اور بہانوں میں چھپائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں چند حقائق کا انکشاف مناسب ہے

د

دنیا میں تخفیفِ اسلحہ کی پہلی کانفرنس اس صدی کے آغاز میں ہیگ میں ہوئی تھی۔ اس زمانے تک اسلحہ بندی کو "قدرتی امر" سمجھا اور مانا جاتا تھا۔ کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ اس رجحان کو بدلا جائے۔ ٹھیک اس زمانے میں میکسم مشین گن ایجاد ہوئی جسے توپ اور الفریڈ نوبل کے ڈائنامیٹ کے پہلو بہ پہلو جنگ کا سب سے طاقتور ہتھیار سمجھا جاتا تھا۔ اس صدی کے دوران میں تخفیفِ اسلحہ کے تصوّر کی بہت پیش رفت ہوئی ہے، لیکن حقیقت کی نہیں! ہم میکسم مشین گن سے آج کے عظیم ایٹمی ہتھیاروں کے ذخیروں تک پہنچ گئے ہیں جن سے دنیا کئی بار برباد کی جاسکتی ہے۔ (محض اصولی اعتبار سے، حقیقت کے اعتبار سے نہیں، کیوں کہ پہلی مکمل بربادی کے بعد مزید بربادی ممکن ہی نہیں) تخفیفِ اسلحہ کا تصوّر قوموں میں سوگنا زیادہ پھیل چکا ہے، لیکن حکمران طبقات نے اسلحہ کی تیاری کو دس لاکھ گنا بڑھا لیا ہے۔ (یہ ادبی مثالیں حقیقی اعداد و شمار نہیں)۔ ایک عالم گیر مفاہمت کے ذریعہ سے جنگ کو ختم کرنے کی پہلی عظیم مشترکہ کوشش جمعیتِ اقوام (لیگ آف نیشنز) تھی جو پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴ء) کے بعد قائم ہوئی۔ یہ جماعت آگ اور خون کے اس ہولناک کھیل کو نہ روک سکی، جو ۱۹۳۹ء میں شروع ہوا اور جس کے نتیجے میں اقوامِ متحدہ (یونائیٹڈ نیشنز) وجود میں آئی۔ اگرچہ یہ بھی بعد کی جنگوں کو روکنے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ یہ حقیقت کہ ہم ایک اور عالمی جنگ سے ابھی تک بچے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ امن کے سلسلے میں مساعی ہو رہی ہیں بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اصل میں جنگی تیاریوں نے جنگ کو اتنا خوف ناک بنا دیا ہے کہ اب جنگ ناممکن ہو گئی ہے۔ غالباً "ناممکن" کا لفظ کچھ زیادہ سخت ہے، کیوں کہ جنگ محض ملتوی ہوئی ہے۔

یہ اشارات شاید بہت زیادہ قنوطی نظر آئیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، اگر ہم وہ عشرے پیشِ نظر رکھیں جن میں جنگ اپنا وقار کھوتی رہی ہے، اور امن پسندانہ مقاصد کو قوت حاصل ہوتی رہی ہے۔ اور بے شک اس دوران میں ہونے والی جنگ کے عرصوں کو بھی سامنے رکھیں۔ فاشزم کی مختلف اقسام کی صورت میں تیز نظریاتی رجعت پسندی کے مظاہروں پر بھی نظر ڈالیں، جب ایک بار پھر یہ پرانے نظریات ابھرے کہ تنازعات کے تصفیے اور عظمتِ آدم کی برقراری کے لیے جنگ کی عالمی قدر و قیمت ہے اور ان عشروں کا موازنہ ان سے پہلے کے اُن ہزارہا سالوں سے کریں، جب جنگ کو عظمت حاصل تھی اور انسان اور اسلحہ کا ساتھ ہمیشہ رہتا تھا، تو ہم محسوس کریں گے کہ ہم انسانوں کی فطرت میں رچے بسے مظاہر کو ختم کرنے کے لیے کچھ ابتدا تو کر رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ نتائج پیدا ہونے میں دیر لگے گی۔

ز

مسئلہ یہ ہے کہ آیا ہمارے پاس کافی وقت ہے یا نہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں امن کے وسائل کے مقابلے میں جنگ کے وسائل بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم مسئلے کی فوری اہمیت کے پیشِ نظر پورے خلوصِ دل کے ساتھ امن پسندانہ حالات کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے اپنی جملہ مساعی مرتکز کر دیں۔ ہمیں صرف اس بات کا خیال نہیں رکھنا کہ تصوّرِ جنگ کے وقار میں کمی ہو بلکہ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ جو معنوی انحراف جنگ کے تصوّر کی حفاظت کرتے ہیں، ان کی بھی ساکھ باقی نہ رہے۔ ہمیں صرف ذہن کے دائرے میں عمل ہی سے نہیں بلکہ ان تمام وسائل کو بروئے کار لا کر جنگ کو ناممکن بنانا ہے جو ہماری دسترس میں ہوں۔

اس کتاب کا مقصد اس عمل کو تیز کرنے کی خاطر مزید سعی کرنا ہے۔ یہ کتاب اُن سخن سازیوں سے بھی پردہ اٹھائے گی اور جائزہ لے گی جن میں سے ایک انسان کی "جبلی جارحیت" کی وہ اصطلاح ہے جسے حال ہی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا یہ مقصد بھی ہے کہ جو فکری انتشار دیدہ و دانستہ پیدا کیا جا رہا ہے اس کا سدِّ باب کیا جائے۔

ایڈوارڈو بارو تیک گلن

ایس۔ گوپی ناتھن

درجِ ذیل مضامین "یونیسکو کوریئر" میں شائع ہوئے ہیں:

جارحیت: جبلّی یا اکتسابی بدچلنی (اگست۔ ستمبر ۱۹۷۰ء)

جنگ ہماری سرشت میں نہیں ہے (اگست۔ ستمبر ۱۹۷۰ء)

امن کی جڑیں (جنوری ۱۹۶۶ء)

امن کا چیلنج (اگست۔ ستمبر ۱۹۶۷ء)

ترقی ــــ امن کا نیا نام (اگست۔ ستمبر ۱۹۶۷ء)

تلوار اور ہل (اگست۔ ستمبر ۱۹۶۷ء)

ضمیمہ الف (نومبر ۱۹۷۰ء)

ضمیمہ ب (نومبر ۱۹۷۵ء)

ضمیمہ ج (نومبر ۱۹۶۴ء)

حصّہ اوّل

انسان کی جارحیت کا مطلب کیا؟

باب اوّل - الف

ڈان بھومان

جارحیت

جبلّی یا اکتسابی بدچلنی؟

کیا انسان وجدان کے پہیے سے منسلک ہے؟ کیا اس کی قسمت میں لکھا ہے کہ وہ جان توڑ جنگ لڑے، اور اس وقت تک راکٹ اور بم کے ذریعہ سے لڑے جب تک وہ اس زمین سے نیست و نابود نہیں ہوتا خواہ اُسے انجام کا پورا پتا ہو؟ یا آیا اس کے دماغ کو یہ سکھایا جا سکتا ہے کہ جو دنیا اب قصّۂ ماضی بن چکی ہے اس میں رہنے کے لیے اسے ایک شکاری جانور کے ناطے جو متشدّد طرزِ عمل درکار تھا اب اُسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے؟

پہلے سوال کا جواب ہے — نہیں۔ دوسرے سوال کا جواب ایک متامل، مشروط ہاں ہے۔ یہ سوالات اور ان کے جوابات ایک ایسی کانفرنس میں اُبھرے جو یونیسکو کے زیرِ اہتمام منعقدہ انتہائی غیر معمولی اجتماعات میں شمار ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ معلوم کرنا تھا کہ سائنس انسان کی جارحیت کو کہاں تک سمجھ سکی ہے اور مستقبل میں اسے تحقیق کے کن خطوط پر کام کرنا ہے۔

یہ کانفرنس اس لحاظ سے غیر معمولی تھی کہ ایسی کسی رسمی کانفرنس سے اس کی مشابہت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بعض اوقات محض گفت گو ہوتی تھی اور بعض اوقات یہ فلسفیانہ مکالمہ ہوتا تھا۔ اس کانفرنس نے اپنا ایک انداز بنالیا۔ کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر کام کی ترتیب ایسے وضع کرلی گئی کہ جہاں کوئی بھی شخص کسی بھی وقت، کسی بھی غیر متوقع انداز اختیار کر سکتا تھا۔

چودہ ملکوں سے اٹھارہ سائنس داں یہ سوچنے کے لیے اکٹھے ہوئے کہ دماغی امن کس طرح حاصل کیا جائے اور اس کے بعد قوموں کے درمیان امن کی صورت کیسے پیدا کی جائے۔ جس مقام پر وہ جمع ہوئے وہ بذاتِ خود امید کی ایک کرن دکھاتا تھا۔ جیسا کہ ایک مندوب نے کہا یونیسکو فرانس کے فوجی اسکول کے بالمقابل پُرامن بقائے باہمی کے اصول پر واقع ہے اور یونیسکو کے دفاتر اس زمین پر ہیں جہاں کبھی

گھوڑسوار دستوں کی بارکیں ہوا کرتی تھیں۔

یہ اجلاس بین القومی، بین الثقافتی اور بین العلمی تھا۔ شرکا نے چوہوں اور انسانوں، دونوں کے بارے میں یہ تبادلِ خیال اور غور کیا کہ ہجوم کے دباؤ میں آ کر دونوں کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے بغداد کے نئے آبادکاروں میں متشدد جرائم اور برکلے میں طلبہ کے ہاتھوں پولیس پر پتھراؤ جیسی باتوں پر گفت گو کی۔ یہ لوگ انڈونیشیا کے ایک جزیرے میں، ایک ایسی افریقی وادی میں جہاں صرف بوزنے آباد ہیں، بوڈاپسٹ کے پُرسکون پُرانے شہر میں اور نیویارک کی ہماہمی میں، زندگی کا آنکھوں دیکھا حال بتا سکتے تھے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ بدتمیز بچّے کی اصلاح کے لیے اُسے تھپڑ رسید کیے جائیں اور یہ تجویز بھی سامنے آئی کہ بندر کی اصلاح یوں کی جائے کہ اس کے دماغ میں ریڈیو سیٹ نصب کر کے اس جانب اشارہ نشر کیا جائے۔

اس اجتماع میں صرف ایک عورت تھی باقی سب مرد تھے۔ ان کے انداز اور مفادات اتنے مختلف تھے کہ نہ وعظ و تلقین کا سوال پیدا ہوتا تھا، نہ کسی عقیدے کے قائل ہونے کا۔ اس کے باوجود یہ سب آپس میں اس طرح گھُلے ملے تھے کہ تبادلِ خیال کے لیے مشترکہ بنیاد کی دریافت کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

سب سے پہلے جس بات پر بحث ہوئی تھی اور جس کا تصفیہ کرنا تھا وہ جارحیت کی حیاتیاتی بنیاد تھی۔ اگر یہ انسان کی سرشت میں ہے تو پھر اس بارے میں کوئی خاص کام نہیں کیا جا سکتا اور ظاہر ہے کہ ایک بین الاقوامی اجلاس میں تو یہ ممکن نہیں، دنیا بھر میں جن مقبول تحریروں نے قبولِ عام حاصل کیا ہے ان میں اس رائے کا اظہار کیا گیا ہے کہ جارحیت محض انسان کی جبلّت ہی نہیں بلکہ یہ ایک اچھی چیز ہے کیوں کہ اس سے دنیا حرکت میں ہے۔

اب تو وزرائے اعظم بھی 'علاقائی ضرورت' کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ بات بڑے افسوس کے ساتھ ایک سائنس داں نے کہی۔ اس نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ جو ماہرینِ حیاتیات انسان اور جانوروں کے طرزِ عمل کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں وہ اس پر زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھ سکتے ہیں۔

اس اجلاس کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ جارحیت جبلّی نہیں ہے۔ ممکن ہے شاید یہ کبھی مفید رہی ہو، لیکن ان دنوں کی بات ہے جب حالات آج کے حالات و تجربات سے بالکل مختلف تھے۔ اس مسئلے پر اجلاس کے سب سے بے باک رکن ڈاکٹر رابرٹ اے۔ ہنڈے نکلے جو برطانیہ کی کیمبرج یونی ورسٹی میں جان داروں کے طرزِ عمل کا مطالعہ کرنے والے ادارے کے ڈائریکٹر ہیں۔ انھوں نے اس تصور پر بھرپور یورش کی کہ انسان کی نسلی بقا کے لیے جارحانہ طرزِ عمل "بیش قیمت" ہے۔
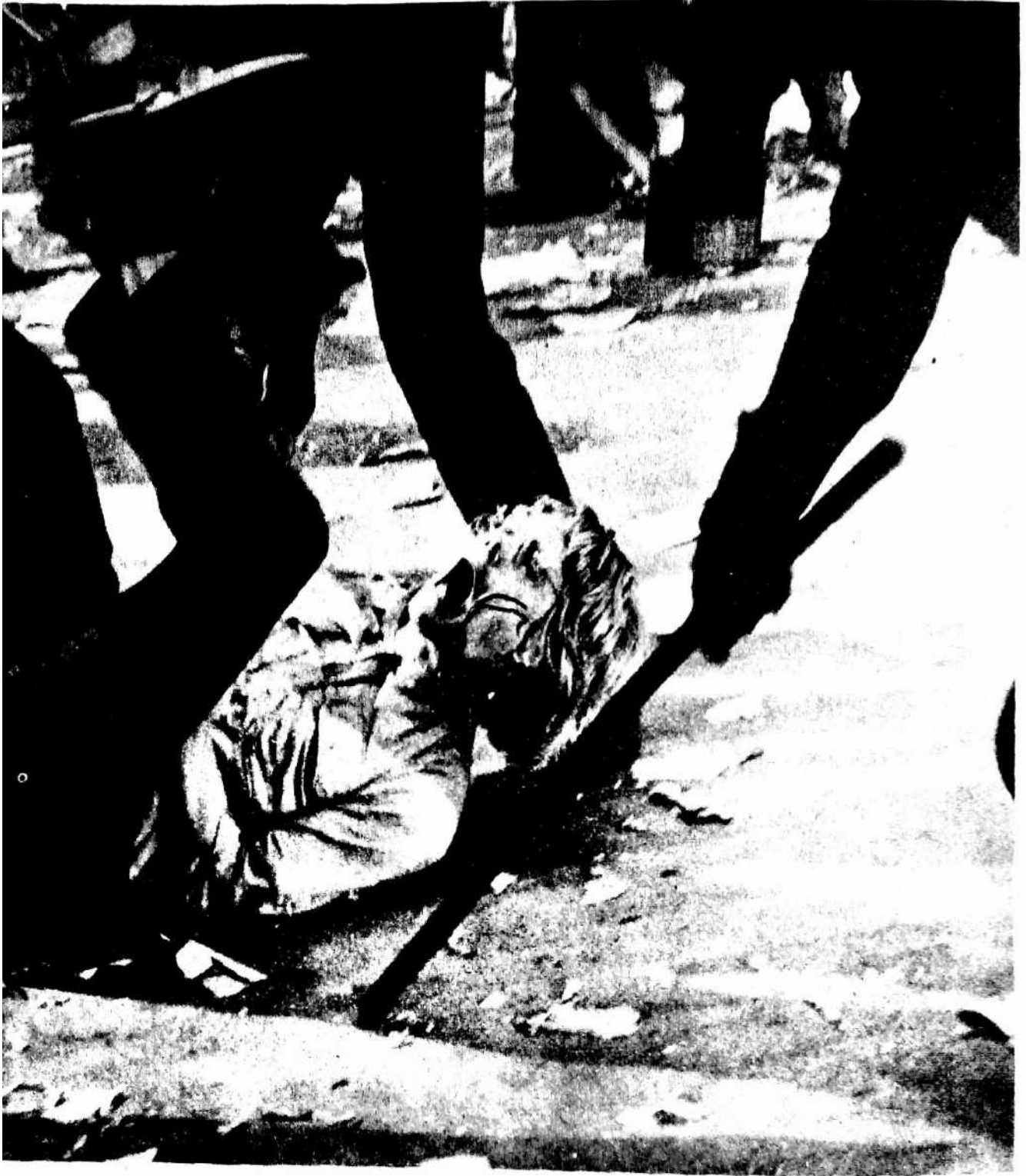
فوٹو میٹرو گولڈوِن میئر

پولیس اور طلبہ کے درمیان گھمسان کا رَن، امریکا کی فلم دی اسٹرابیری اسٹیٹ منٹ سے لیا ہوا ایک شاٹ ہے۔ اس فلم میں یونی ورسٹی کیمپس میں نوجوانوں اور ہیئتِ حاکمہ کے درمیان آج کی کش مکش کے عالمی مسئلے کو ڈرامے کے رُوپ میں پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ہنڈے نے کہا کہ "انسان کا ثقافتی ارتقا آج جن حالات میں ہوتا ہے وہ قدرتی تبدیلیوں کے حالات سے بالکل مختلف ہیں۔" انھوں نے یہ بھی کہا، "کیا ہمارا معاشرہ ایسے افراد کو دوام دینا چاہتا ہے جو جارح ترین ہوں؟ کیا ہم یہ سوچتے ہیں کہ انسان میں طاقت اور عقل کا باہمی تعلق ہے؟ بندروں میں تو یقیناً یہ صورت نہیں ہے.."

"یہ بھی کہا گیا ہے کہ معاشرے میں نظامِ مراتب کے قیام کے لیے جارحیت درکار ہے۔ اس لئے کے مطابق جارحیت کے نکاس کے لیے اچھوتوں کا وجود ضروری ہے، لیکن آیا کسی نے اس بارے میں اچھوتوں سے بھی دریافت کیا ہے؟" بعض نازک امتیازات کا تعین بھی ضروری تھا بالخصوص بعض معنوی خطوط پر۔ برکلے کی یونی ورسٹی اوف کیلے فورنیا میں علم الانسان کے پروفیسر ڈاکٹر شیر وُڈ واش برن نے اس سے اتفاق کیا ہے کہ ممکن ہے جارحیت انسان کی جبلّت نہ ہو۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جارحیت بڑی آسانی کے ساتھ سیکھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے کہا، "کسی لڑکے کو رائفل دو، وہ باہر نکلے گا، اور شکار کرے گا۔ یہ چیز ہماری جبلّت، ہماری فطرت میں ہے۔ ہجوم متشدّد ہوتے ہیں۔ فوجیں متشدّد ہوتی ہیں۔ کانگو کی طرف دیکھو، ویت نام کی جانب دیکھو۔ انسان کے لیے انتہائی متشدّد ہونا آسان ہے۔" بغداد کی جامعۂ مستنصریہ میں نفسیاتی علاج کے پروفیسر ڈاکٹر علی کمال نے اختلاف کرتے ہوئے کہا، "میں اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ جارحیت اکتسابی ہوتی ہے۔ یہ تو گناہِ اوّل کی طرح قدیم ہے۔"

اجلاس کے صدر ڈاکٹر ڈیوڈ ہمبرگ تھے جو کیلے فورنیا میں اسٹینفورڈ یونی ورسٹی اسکول اوف مڈیسن کے شعبۂ علاجِ نفسیاتی کے صدر رہیں۔ انھوں نے اس مسئلے پر دوسرے مسائل کی طرح بہ ظاہر متنازعہ آرا کو یک جا فرمایا، لیکن ضروری نہیں کہ ان میں ترمیم و اضافے سے کم از کم مشترکہ قدریں بھی دریافت کر لی ہوں، بہر حال ڈاکٹر ہمبرگ نے بلند آہنگ سوچ کے ساتھ اس تاثر کا اظہار فرمایا کہ شاید انسان کا حیاتیاتی ساز و سامان ہو یا وہ متشدّد طرزِ عمل جو اس سے جنم لیتا ہے، اصلاً فرسودہ، دقیانوسی اور قابلِ ترک ہے۔

یونیسکو کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل برائے علومِ عمرانی، بشریات و ثقافت پروفیسر رچرڈ ہاگرٹ نے اجلاس کا افتتاح فرمایا اور دوسرے مقرّرین کی طرح انھوں نے بھی یہی نکتہ پیدا کیا کہ دنیا بدل چکی ہے، لیکن انسان نہیں بدلا، اسے ابھی وقت نہیں ملا کہ شکاری انسان کی جبلّت سے جسمانی طور پر آگے بڑھے۔ اس کے باوجود سوائے چند چھوٹے چھوٹے علاقوں کے ساری دنیا میں طرزِ زندگی کی حیثیت سے شکار نابود ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر ہمبرگ نے یہ ظاہر کرنے کے لیے اس تبدیلی پر وقت کا پیمانہ منطبق کیا کہ انسانی ارتقا اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم چلنے کے ناقابل رہا جس نے غار میں آباد انسان کو شہری انسان بنا دیا۔

دودھ پلانے والے جانور آج سے پچاس ملیون سال پہلے اس دھرتی پر نمودار ہوئے۔ کُنبے کی صورت میں سکونت ۴ ملیون سال پہلے اختیار کی گئی۔ ہماری اپنی نوعِ انسانی چالیس ہزار سال پُرانی ہے۔ زراعت تقریباً آٹھ ہزار سال پہلے شروع ہوئی اور جہاں تک اس صنعتی انقلاب کا تعلق ہے جو جدید دنیا کی صورت کا ذمہ دار ہے تو صرف دو سو سال پُرانا ہے۔ اور دو سو سال کا عرصہ کیا ہے؟ گویا "ارتقائی زبان میں محض ایک لمحہ"۔ ایسے میں یہ کوئی خاص اچنبھے کی بات نہیں کہ زمین کے اندر دبے ہوئے انسانی ڈھانچوں کے تجزّات کی تقسیم کی بنیاد پر اخذ کیے ہوئے نتائج کے مطابق جس شکاری انسان کو سکونت اور بقا کے لیے دس مربع میل فی کس رقبہ درکار تھا اسے کارخانوں، دفتری عمارتوں اور شہروں میں اپنے آپ کو سمانے میں اتنی تکلیف ہو رہی ہے۔

جان داروں کے طرزِ عمل سے اسباق

اگر انسان جبلّی اور فطری انداز میں جارح پیدا نہیں ہوا تو پھر وہ جارحیت کیوں اختیار کر لیتا ہے؟ اجلاس میں یہی مسئلہ سوچ کا نقطۂ ماسکہ بنا رہا اور اسے پہلے تشکیلِ کردار کے نقطۂ نگاہ سے یعنی جان داروں کے طرزِ عمل کے علم سے جانچنے کی سعی کی گئی جو معاشرتی اور قدرتی علوم کے بَین بَین واقع ہے۔

جانور چڑیا گھر یا لیبورٹری کے مصنوعی ماحول کے مقابلے میں قدرتی ماحول میں کس طرح عمل کرتے ہیں؟ اس کی مکمل ترین کہانی ڈاکٹر جین واں لاوِک گڈال نے سنائی جنھوں نے تنزانیہ میں گومبے اسٹریم ریسرچ سنٹر میں انسان سے مشابہ افریقی لنگوروں (چمپانزی) کے مشاہدے میں دس سال صرف کر دیے۔ انھوں نے کہا کہ اب یہ لنگور میرا کوئی خاص نوٹس نہیں لیتے۔ ان کے لیے ایک پتھر، ایک درخت، ایک بندر یا بَبون میں کوئی فرق نہیں۔ جب یہ لنگور اپنے جارحانہ طرزِ عمل کے دائرے میں مصروف ہوتے ہیں تو میں جتنے فاصلے سے اُن کا مشاہدہ کر سکتی ہوں وہ ایک کمرے کے فاصلے سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ یہ صبر طلب کام ہے، کیوں کہ اس قسم کے لنگور کسی ایک جارحانہ واقعے کے بغیر بھی کئی کئی دن گزار دیتے ہیں۔

کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ پہلے جان دار میں ایک "کم شدید تخویف" کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ سر کو جھٹکاتا ہے۔ تھوڑا سا کھانستا ہے۔ پھر وہ کندھوں کو خمیدہ کر کے ایک بڑے نر کے سامنے پہنچتا ہے۔ اس کے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ زور سے زمین پر پاؤں مارتا ہے۔ ایک درخت کے تنے پر ضرب لگاتا ہے۔ ایک شاخ گھما کر ڈراتا ہے یا پتھر مارتا ہے۔ اس اجلاس میں بتایا گیا کہ جانور جب ذرا نرم انداز میں دوسروں کو دھمکائیں تو اسے انسانوں کے درمیان

تصاویر: بیرن ہیوگو وان لاوِگ ©نیشنل جیوگرافک سوسائٹی

یہ تصاویر تنزانیہ کے ایک جنگل میں لی گئی تھیں۔
پہلی تصویر میں ایک نوجوان نر لنگور دکھایا گیا ہے
جس نے ڈنڈا اٹھا رکھا ہے اور ایک کیڑے کو زمین پر
مار رہا ہے۔ دوسری تصویر میں وہ ناچ کر اپنی فتح
کی خوشی منا رہا ہے۔

زبانی جھگڑوں سے مماثل سمجھا جا سکتا ہے۔

لنگور لڑنے کے فن میں احتیاط پسندی میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں اور شاید ہی کبھی سچ مچ کے جسمانی تشدّد پر اترتے ہیں۔

ڈاکٹر واں لاوِک گڈال بتاتی ہیں کہ اگر ان میں کبھی جسمانی تشدّد کی نوبت آجاتی ہے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو چند خراشیں آئی ہیں یا وہ بالوں کے کچھ گچھے کھو بیٹھے ہیں۔ یہ دو جانور اگر کسی ڈھلوان پر زور شور سے لڑتے لڑتے لڑھکیں تو بھی فوراً بعد ایسا نظارہ ہوتا ہے کہ دونوں میں صلح ہوگئی۔ جو حملے کا شکار ہوا وہ ہاتھ آگے بڑھاتا ہے۔ حملہ آور اس کے سر پر تھپکی دیتا ہے اور اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کی دل جوئی اور دیکھ بھال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر واں لاوِک گڈال کہتی ہیں میں نے کبھی لنگوروں میں ایسی لڑائی نہیں دیکھی جس کا انجام کسی ایک کی موت پر ہوا ہو اور نہ میں نے جان داروں کی اس ادنا قسم میں کبھی یہ مشاہدہ کیا ہے کہ انھوں نے دھڑے یا گروہ بنا کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ آزمائی کی ہو۔

وہ جس دنیا کا مشاہدہ کرتی ہیں وہ اتنی مہذّب ہے کہ جو شخص اس کا حاکم بنا اسے اپنی رعایا کے خلاف ہاتھ اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ وہ ۱۹۶۴ء سے اس رہنما (مائک) کی زندگی دیکھ رہی ہیں جب وہ لنگور نہیں، لنگور کا بچّہ تھا اور جتنے لنگور اس کے آس پاس تھے ان سے اکثر تھوڑی بہت مار کھانے پر مجبور تھا۔ اس کے بعد اس نے پیرافین کا ایک خالی ڈبّہ لیا اور اسے اِدھر اُدھر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ بہت جلد ایک کے تین ڈبے ہوگئے۔ وہ جب ان ڈبّوں کو پوری رفتار کے ساتھ گھسیٹتا تھا تو اتنی آواز آتی تھی جتنی شاید کسی ایکسپریس ٹرین کی بھی نہ ہو۔ دوسرے لنگور اس آواز سے ڈرتے تھے اور جوں ہی ڈبّے آتے وہ خوف کے مارے درختوں پر چڑھ جاتے۔ بس اس وقت سے مائک ان لنگوروں کا سردار ہے۔

لنگوروں پر جارحیت کے آثار اس وقت نمایاں ہوتے ہیں جب ان پر کوئی حملہ کرتا ہے۔ وہ خوراک کے معاملے میں اوّل تو شاذ ہی لڑتے ہیں اور جب لڑتے ہیں تو کسی پسندیدہ چیز کی کمی کی وجہ سے۔ مایوسی بھی ایک سبب ہے جو جارحیت کی طرف پیش رفت کا ذمّے دار بنتا ہے۔ اگر ایک گروہ میں سے کوئی بڑا لنگور اپنے سے چھوٹے پر حملہ کرتا ہے تو یہ چھوٹا اپنے سے چھوٹے پر غصّہ اتار دیتا ہے۔ اگر کوئی مادہ لنگور نر لنگور کی محبّت کا مثبت جواب نہیں دیتی تو نر لنگور ہیجان میں آکر مادہ پر حملہ کرتا ہے۔ جو فرد دوسروں سے مختلف ہو اسے دشمنی مول لینی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر واں لاوِک گڈال نے بتایا کہ جن بچّوں کی مائیں کھو جاتی ہیں یا مر جاتی ہیں ان کی مخالفت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک نو عمر لنگور کو جو پولیو کا شکار ہو کر ٹانگیں استعمال

کرنے سے عاجز تھا ایسی دشمنی سے سابقہ پڑا۔

مادہ لنگور نر لنگور کے مقابلے میں کم جارح ہوتی ہے، لیکن شاید وہ زیادہ خطرناک بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر واں لاوِک گڈال نے وضاحت فرمائی کہ نر لنگور لڑتے بھی ہیں اور فوراً ایک دوسرے کو معاف بھی کر دیتے ہیں۔ اگر نر لنگور حملہ کرے تو مادہ لنگور طرح دے جائے گی۔ اس کے آدھ گھنٹے بعد ہی وہ کسی اور نر کے پاس جائے گی اور اسے بدلہ لینے پر اکسانے میں کام یاب ہو جائے گی۔ ڈاکٹر واں لاوِک گڈال نے کہا، "یہ کہنا انصاف کی بات نہیں کہ معاشرے کے جارحانہ پہلو میں عورتیں کوئی کردار ادا نہیں کرتیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ عورتیں مردوں کو جارحیت پر اکساتی رہی ہیں۔"

انسانی طرزِ عمل کے متوازی عمل کا مشاہدہ لنگوروں کی اُن حرکات سے بھی ہو سکتا ہے جب تجربہ گاہ کے کارکن انھیں خوراک دیتے تھے۔ قدرتی حالات ہوں تو لنگور آرام سے درخت سے پھل اتار سکتا ہے۔ لنگوروں کا درجہ بلند ہے وہ باقی لنگوروں کے لیے بھی کافی خوراک چھوڑ دیں گے۔ پھر اس باغِ عدن میں کیلے رکھے گئے۔ انھیں مقفّل بکسوں میں بند رکھا گیا۔ جانور جانتے تھے کہ انھیں سارے کے سارے کیلے بیک وقت نہیں ملیں گے۔ اس لیے کیلوں کی تقسیم کے وقت وہ آپس میں لڑتے تھے۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک غلبہ آور جانور پچاس کیلے بغل میں داب کر ایک طرف ہو جائے اور کسی کو ایک چھلکا تک دینے کا روادار نہ ہو۔ کچھ شرارت پسند نو عمر لنگوروں نے وہ چابیاں لے لیں جن سے مقفّل ڈبے کھلتے تھے۔ وہ ان چابیوں کو پاؤں کے نیچے دبا کر مزے سے بیٹھے رہتے۔ جب بڑی عمر کے لنگور چلے جاتے تو یہ لوگ بکس کھولتے اور کیلے کھا لیتے۔ غذا کی فراہمی کے اس طریقے پر جب ایک سال گذر گیا تو اسے بند کر دیا گیا، کیوں کہ اس سے اور زیادہ جارحیت جنم لیتی تھی۔

سائنس دانوں سے توقع تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ وہ لنگوروں سے حاصل کیے ہوئے اسباق کے انسانوں پر نفاذ کے سلسلے میں بہت متامّل ہوں گے، لیکن حیرت کا مقام یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر واش برن نے واشگاف انداز میں کہا کہ انسان اور لنگور، کتے اور لومڑی یا بلّی اور شیر کے مقابلے میں کیمیائی حیاتیاتی ترکیب کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے بن مانس یا گوریلا اور لنگور (چمپانزی) آپس میں اتنے ہی مختلف ہیں جتنے انسان اور لنگور۔

انھوں نے جاپان اور امریکا میں ریسرچ کا ذکر کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک ہیموگلوبن میں امینو ترشوں کے سلسلے کا تعلق ہے انسان اور گھوڑے کے درمیان اس ضمن میں

باون فرق موجود ہیں۔ لنگور اور گوریلا میں دو، اور انسان اور لنگور (چمپانزی) میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ڈاکٹر واش برن نے پیش گوئی فرمائی کہ آئندہ پانچ سال کے اندر اندر سائنس ایک "کیمیائی کلاک" بنانے میں کام یاب ہو جائے گی، جس سے قدیم ترین مخلوق کے مختلف گروہوں کے درمیان علاحدگی کے وقت کا تعین ہو سکے گا (مثلاً بندروں، بوزنوں اور انسانوں کے درمیان) اور وقت کے تعین میں تقریباً ایک ملیون سالوں کی غلطی کا امکان نہیں ہوگا۔

اجلاس میں بہت سی ایسی آوازیں بھی اٹھیں جو اس بات پر مصر تھیں کہ انسان کو جانور قرار دیا جائے، تاکہ جانوروں کی تشکیلِ سیرت کا انطباق انسانی صورتِ حالات پر بھی ہو سکے۔ پھر اس مسئلے کو ایک اور انداز سے سوچا گیا۔ کنیڈا کے ایک ماہرِ علوم انسانی ڈاکٹر لائنل ٹائیگر نے یاد دلایا کہ انسان کس طرح دورانِ جنگ میں اپنے جنگی دشمنوں کو انسانوں سے ادنا قرار دیتا ہے۔

ارتقا کے شجرے میں جن مخلوقات کا ذکر آیا، ان سے بہت ادنا چوہے ہیں اور وہ بھی ہمیں بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔ فرانس میں اسٹراس برگ کی سائنس فیکلٹی کی نفسی عضویاتی تجربہ گاہ کے پروفیسر ڈاکٹر فلپ روپارٹز نے اس پہلو پر بہت کام کیا ہے کہ مختلف جانوروں تک معلومات نشر کرنے اور انھیں جارحیت پر اکسانے میں بُو کا کردار کیا ہے؟

انھوں نے سامعین کو یاد دلایا کہ انسانی مبصر کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ جانور بُو سے کیا کچھ معلوم کر لیتے ہیں، کیوں کہ ان کے لیے بُو قریب قریب انسانی زبان کے برابر ہے۔ تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتے صرف بُو کے احساس سے یہ بتا سکتے ہیں کہ ان کا آقا شہر میں ہے یا دیہات میں ہے اور یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ آقا کا موڈ اچھا ہے یا بُرا۔

جن محققین نے چوہوں پر کام کیا ہے وہ بتلاتے ہیں کہ اگر عملِ جراحی کے ذریعہ سے قوتِ شامہ کو ختم کر دیا جائے تو نر چوہے لڑنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ جب نارمل ناک رکھنے والے چوہوں پر نسوانی خوشبو چھڑکی گئی تو ان کی جارحیت میں کمی آ گئی۔ جراحی کی طرح اس نے چوہے کی قوتِ شامہ کو اس طرح سُن کر دیا کہ وہ دشمن اور دوست میں امتیاز کے قابل نہ رہا۔ ڈاکٹر روپارٹز نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا "انسان ازمنۂ قدیم سے خوشبو استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ غالباً یہ بھی مرد کی اس جارحیت میں کمی کر دیتی ہے جو وہ عورت کے لیے محسوس کرتا ہے۔"

ڈاکٹر روپارٹز نے یہ بھی کہا کہ چوہے ایسی دو صورتوں میں زیادہ متشدد ہوتے ہیں کہ انھیں یا تو دوسروں سے بالکل الگ تھلگ رکھا جائے یا ان کی تعداد زیادہ ہو اور جگہ کم۔ ایسے

ہی طرزِ عمل کا مشاہدہ ان بندروں میں کیا گیا ہے جو یا تو الگ تھلگ رکھ کر پالے گئے یا انھیں پر ہجوم چڑیا گھروں میں رکھا گیا۔ جب جانور پنجروں میں بند ہوتے ہیں تو وہ معاشرتی اعتبار سے کم تر حیثیت کے ہوتے ہیں اور ان پر غلبہ پانے والے جانوروں میں رابطہ ہوتا ہے، وہ مستقل طور پر ایک دوسرے پر نظر رکھتے ہیں، گھورتے ہیں اور دھمکیوں کے نتیجے میں جارحیت کا سلسلہ چلتا ہے اور جارحیت سے مزید خطرات وجود میں آتے ہیں۔ چڑیا گھروں میں ایسے جانوروں کے درمیان ٹولیوں میں بٹ کر جنگ ہوتی ہے جو جنگل میں امن اور چین کے ساتھ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو زندگی گزارتے ہیں۔ ان نتائج پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر روبارٹز نے یہ سوال اٹھایا کہ آیا اس قسم کا برائی کا چکّر ان بڑے شہروں میں نہیں چلتا جہاں متشدد جرائم کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہجوم جس متشدد مجرم کو جنم دیتا ہے اسے جب قید خانے کی کوٹھڑی میں دوسروں سے الگ کر دیا جاتا ہے، جو اس کی پچھلی زندگی کے بالکل برعکس زندگی کا نمونہ پیش کرتا ہے تو یہ انتہا غالباً اُسے اور بھی زیادہ متشدد بنا دیتی ہے۔

اس قیاس آرائی کا ردِ عمل ڈاکٹر مکلوس کن کی جانب سے ہوا جو بوڈاپسٹ کے ایوٹ ووس لورینڈ کالج میں نفسیات کے پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر کن نے سارے اجلاس میں اپنے تبصرے کی بنیاد ذاتی تجربے پر رکھی۔ یہاں انھوں نے اپنے دو ایسے مریضوں کا تذکرہ کیا جنھوں نے پانچ پانچ سال سے زیادہ عرصہ قیدِ تنہائی میں گزارا تھا۔

انھوں نے کہا، "وہ لوگ جنھیں معاشرے نے مسترد کر دیا تھا بلند اخلاقی معیار کے حامل تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جیل کی زندگی میں وہ اس وقت بہت خوش ہوتے تھے جب وہ سو سکتے تھے۔ ان کو واضح خواب آتے تھے۔ جن میں کئی تصویریں ابھرتی تھیں اور ان کا ماضی لوٹ آتا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئے تو وہ بار بار مایوسی کے دوروں میں مبتلا ہوئے، لیکن اُن کی جارحیت میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔"

ڈاکٹر کن نے ان بعض تجاویز کی مخالفت کی جو ڈاکٹر جوز ڈیلگاڈو نے مستقبل میں انسان کی حیاتیاتی منصوبہ بندی کی ضرورت کے سلسلے میں پیش کی تھیں۔ انھوں نے کہا، "میں ایک نئے انسان کی منصوبہ بندی کے بارے میں رجائی نہیں ہوں، البتہ ایک نئی دنیا کی منصوبہ بندی کے بارے میں ضرور رجائی ہوں۔"

ڈاکٹر ڈیلگاڈو کے تصورات یقیناً اُن تصورات میں شامل تھے جن پر یونیسکو کے اجلاس میں سب سے زیادہ گرما گرم بحث ہوئی۔ موصوف ایک ہسپانیہ نژاد ماہرِ عضویات ہیں۔ انھوں نے یونیسکو

کے دستور العمل کے ابتدائیے کے اس اقتباس سے محض یہ لفظی مطلب اخذ کیا کہ "جنگوں کا آغاز انسانی اذہان میں ہوتا ہے اس لیے انسانوں کے اذہان ہی میں ان کے دفاعی مورچے تعمیر کرنے ضروری ہیں" یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس نے بندروں کے اذہان میں ایسے مورچوں کی تعمیر پہلے ہی شروع کر رکھی ہے۔

ڈاکٹر ڈیلگاڈو اس وقت پہلی بار منظرِ عام پر آئے جب وہ ایک حملہ آور سانڈ کے ساتھ رِنگ میں داخل ہوئے اور اسے رومال گھما کر نہیں، بلکہ محض بٹن دبا کر پرے جانے پر مجبور کر دیا۔ سانڈ کے دماغ میں ایک دوطرفہ ریڈیو نصب تھا تاکہ ایک برقی صدمے سے اس کے طرزِ عمل کو بدلا جاسکے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ڈیلگاڈو نے مزید کام کیا۔ انھوں نے سامعین کو بتایا، "آنے والے پانچ سالوں میں ہم جارحانہ طرزِ عمل کے طبّی علاج میں جو انقلاب دیکھیں گے وہ اتنا ہی اہم ہوگا جتنا کہ متعدی امراض کے علاج میں ضدِّ جیوی ادویہ کے استعمال سے ہوا ہے۔ انھوں نے کہا، "میری یہ پیش گوئی اس علمی تحقیق پر مبنی ہے جو اندرونِ دماغ کی اس میکانیت کے بارے میں ہو رہی ہے جس کا تعلق طرزِ عمل سے ہے۔" انھوں نے مزید کہا، "اب ہم باہر سے تماشا کرنے والوں میں نہیں ہیں۔ اب ہم دماغ کی اندرونی گہرائیوں میں داخل ہو کر مشاہدہ کرتے ہیں کہ انسان کس حالت میں جارحیت یا غصے کا مظاہرہ کرتا ہے۔"

ڈاکٹر ڈیلگاڈو اپنے کام کا آغاز جانوروں سے کرتے ہیں۔ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ جب جانور تجربہ گاہ کی فضا میں نہیں بلکہ تقریباً نارمل معاشرتی ماحول میں آزاد ہوں تو ان کے دماغوں میں کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں دو تکنیکوں کا تذکرہ کیا۔

پہلی تکنیک کے مطابق دماغ کے اندر ایک نہایت پتلی سی نلکی نصب کی جاتی ہے اور اس سے کھال کے نیچے دو غشائی ظروف منسلک کر دیے جاتے ہیں۔ اس طرح سے سائنس داں اس قابل ہوتا ہے کہ دماغ میں ایسی دوائیں داخل کر دے جن سے بعض حصص کے کام بند ہو سکتے ہیں، گویا یہ بعض امراض کے علاج میں جراحی کا بدل ہے۔ نشان زدہ مواد بھی جانور کے دماغ میں داخل کرکے بعد میں یہ جاننے کے لیے اس کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے کہ "آیا مختلف طرزِ عمل کی صورت میں نیورو کیمیائی ساخت مختلف ہو جاتی ہے" اور یہی ہوا۔ دوسری تکنیک کو ہم "ہیجان گیر" کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک دوطرفہ ریڈیو ہے جو "مہیّج" بھی ہے اور "احساس گیر" بھی۔ اس طریقے کے مطابق ایک بندر کے دماغ کے تین ہزار مختلف حصّوں کا مطالعہ کیا جاچکا ہے۔

اپنی تازہ ترین صورت میں "ہیجان گیر" کو ایک کمپیوٹر سے منسلک کیا گیا تاکہ لنگوروں کی ایک ایسی

بتی کے طرزِ عمل کا مسلسل جائزہ لیا جا سکے جو ریاست ہائے متحدہ امریکا کے مغربی علاقے میں واقع نیو میکسیکو کے مقام ہالومان نامی ایک مصنوعی جزیرے پر بسائی گئی تھی۔ لنگوروں کی بے ساختہ سرگرمیوں سے جو سگنل آتے ہیں کمپیوٹر ان کی تحلیل کرتا ہے اور انھیں پہچانتا ہے۔ اگر طرزِ عمل میں کوئی خاص تبدیلی واقع ہو مثلاً جارحیت، تو کمپیوٹر دماغ کے ایک مختلف حصے کو اشارہ کرتا ہے تاکہ ایسا طرزِ عمل باقی نہ رہے۔ ڈاکٹر ڈیلگاڈو کے بیان کے مطابق اس طرح دماغ اپنی سرگرمیوں کو بدلنا سیکھتا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر موصوف نے بتایا کہ انھوں نے انسانی مریضوں پر بھی کام کیا اور ان کے دماغوں میں بھی "ہیجِ گیر" نصب کیے۔ انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا، اگر کوئی شخص معاشرہ دشمن طرزِ عمل کا مظاہرہ کر رہا ہو تو ہم بعض کیمیائی اور برقی ساختوں کو پہچان کر انھیں بدل سکتے ہیں۔

یہ کہنے کی شاید ضرورت نہ ہو کہ پیرس کے اجلاس میں موصوف کے رفقائے کار نے بڑی سخت نکتہ چینی کی اور ان کے اندیشوں کو میکسیکو کی نیشنل یونی ورسٹی کے شعبۂ معاشری نفسیات کے صدر ڈاکٹر ہیکٹر ایم۔ کاپیلو نے یہ کہہ کر پیش کیا، "یہ بات تو معقول ہے کہ ان طریقوں سے کام لے کر طرزِ عمل کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات معقول نہیں کہ ان طریقوں سے یہ فیصلہ کیا جائے کہ کس قسم کے طرزِ عمل کو کنٹرول کرنا چاہیے۔"

اس پر ڈاکٹر ڈیلگاڈو حیران و پریشان نہ ہوئے کیوں کہ وہ قدرتی طور پر ایسی نکتہ چینی کے عادی ہوں گے جس سے بعض اوقات ایسے اشارے بھی ہوتے ہیں کہ وہ جارج آرویل کی کتاب "۱۹۸۴" کی خیالی دنیا تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کہا کہ میں نے دماغوں میں برقی ہیجِ گیر نصب کرنے کی تکنیک اس لیے برتی کہ میں دماغ میں اعصابی بافتوں کو الگ کرنے کی تکنیک استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ اگر پارکنسن کی بیماری، مرگی یا بے قابو درد جیسے امراض کے علاج میں ایسی تکنیک استعمال کی جائے تو اس سے ناقابلِ بحالی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر ڈیلگاڈو نے کہا، "کیا یہ ایک خطرناک بات ہے کہ ہم پہلے سے کہیں زیادہ وسیع علم حاصل کرنے تک اس کام کو جاری رکھیں؟ معاف کیجیے گا۔ ہمارے مریض انتظار نہیں کر سکتے۔ اگر ایک شخص بے قابو درد میں مبتلا ہے تو وہ علاج کے لیے دس سال تک انتظار نہیں کر سکتا۔"

پھر انھوں نے ڈاکٹر کاپیلو اور اپنے دوسرے نکتہ چینوں کو یقین دلایا، "یہ تکنیک انسانی

طرزِ عمل کو کنٹرول کرنے کے لیے استعمال نہیں کی جاسکتی۔ یہ اوّل تو تحقیق اور علاج کے لیے ایک طبّی اوزار ہے، دوسرے یہ پتا چلانے کی ایک نئی کوشش ہے کہ انسان اپنے دماغ کے اندر حقیقت میں کیا ہے۔ میں یقیناً ایسا کوئی دعوا نہیں کرتا کہ ہم اپنے بچّوں اور سیاست دانوں کے طرزِ عمل کو بدلنے کے لیے ان کے دماغوں میں "ہیجِ گیر" آلات نصب کرنے والے ہیں۔"

ڈاکٹر ڈیلگاڈو نے اپنے تجربات کی رنگین سلائڈیں دکھائیں، جن سے ظاہر ہوتا تھا، کہ "ہیجِ گیر" کس طرح ایک بندر کو چلا سکتا ہے اور پھر بھگا سکتا ہے۔ سلائیڈوں کے ایک اور سیٹ میں ان بزدل افراد کے خواب کا جواب موجود تھا جو افسر کے کمرے میں داخل ہوتے وقت خوف سے کانپنے لگتے ہیں۔

پنجرے میں ایک ڈرپوک بندر رکھا گیا اور ایک ایسا غلبہ پسند بندر بھی اس میں تھا جس کے دماغ میں "ہیجِ گیر" نصب تھا۔ پنجرے ہی میں ایک لیور یا آلہ نصب کیا گیا جو غلبہ پسند بندر کے دماغ میں سگنل بھیجتا تھا جن سے شیر میں بکری کی صفات پیدا ہو جاتی تھیں۔ ڈرپوک بندر نے بہت جلد سیکھ لیا کہ آلے کو کس طرح استعمال کیا جائے۔ نتائج حیران کن تھے۔ ایک سلائیڈ میں دکھایا گیا کہ غلبہ پسند بندر نے مغلوب بندر کی حالت قابلِ رحم بنا رکھی ہے۔ دوسری سلائیڈ میں دکھایا گیا کہ بٹن دباتے ہی غلبہ پسند بندر پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ وہ دبک کر بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر ڈیلگاڈو کو یقین ہے کہ دماغ جارحیت سیکھتا ہے۔ وہ کہنے لگے، "کیا انسان میں قتل کرنے کی کوئی جبلت موجود ہے؟ نہیں۔ انسان تہذیب ہی کے ذریعے سے کسی سانچے میں مکمل طور پر ڈھل جاتا ہے۔ انسان اور جانوروں میں فرق یہ ہے کہ پیدائش کے وقت انسان کا دماغ اتنا ناپختہ ہوتا ہے کہ حسیّاتی امداد کی غیر موجودگی میں دماغ کام ہی نہیں کر سکتا۔ پیدائشی عناصر صرف گھٹانے بڑھانے میں کام آتے ہیں۔ دماغ کے معلوماتی ماخذ پیدائشی نہیں تہذیبی ہیں۔"

اس مفروضے کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ بچّے کی تعلیم کا مقصد یہ نہ ہو کہ معاشرے کو مشینی رنگ دیا جائے بلکہ یہ ہو کہ اس کے دماغ کا نشوونما ہو سکے۔ انھوں نے کہا، "ہم تمدّن کے ایک نازک مرحلے میں ہیں۔ کسی زمانے میں فطرت انسان کو کنٹرول کرتی تھی۔ اب انسان فطرت کو کنٹرول کرتا ہے۔ اب ہم بہت جلد انسان کو قابلیّت اور ذہانت سے کنٹرول کر سکتے ہیں۔ ہم انسان کی مادی قوتوں اور اس کے دماغی رجحان کے درمیان عدم توازن کو درست کر سکتے ہیں، کیوں کہ ہم ابھی اتنے وحشی ہیں جتنے چند صدیاں پہلے تھے۔" اجلاس کے صدر ڈاکٹر ڈیوڈ ہمبرگ نے جارحیت کے ماخذ کو ایک اور زاویۂ نگاہ

سے جانچا۔ انھوں نے اس تحقیق کا تذکرہ کیا جس نے بچّوں میں جارحیت کے ڈانڈے ماؤں میں مردانہ جنسی ہارمون ٹیسٹوسٹرون کی غیر معمولی مقدار میں موجودگی سے ملائے ہیں۔

ڈاکٹر ہیمبرگ نے بتایا کہ اس وقت اتنا علم موجود نہیں کہ نتائج کو عملی طور پر آزمایا جائے، لیکن "چند عشرے بعد" یہ ممکن ہوگا کہ ڈاکٹر اور اس کا مریض کسی "نہایت جارح فرد" جو ممکنہ طور پر ہٹلر یا چنگیز خان بن سکتا ہو، کی ولادت کو روکنے کے لیے اسقاطِ حمل کا فیصلہ کریں۔

اگر مردانہ جنسی ہارمون کسی قدر کم سطح پر موجود ہوں تو اس سے مستقبلِ بعید میں حاملہ ماں کا علاج ایسے جوہروں سے ہوسکتا ہے جو مردانہ ہارمون کے اثرات کا توڑ ثابت ہوں۔ ایسے جوہر اسی طرح دیے جاسکیں گے جیسے دانتوں کو بوسیدگی سے بچانے کے لیے پینے کے پانی میں فلورائڈ ملادی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ہیمبرگ نے کہا کہ جس طرح فلورائڈ ملانے سے سیاسی مسائل پیدا ہوتے ہیں اسی طرح جوہر دینے سے سیاسی مسائل اُٹھ سکتے ہیں۔ قومیں یہ نہیں چاہیں گی کہ خود نمائی، قوت اور پکّے ارادے کی خصوصیات کھو بیٹھیں جن کے ڈانڈے بہت سوں کے نزدیک ایک جارح شخصیت سے مل جاتے ہیں۔ چناں چہ زیادہ خطرناک جارحیت کے حیِ کیمیائی علاج کے لیے "شاید بین الاقوامی معاہدات کا ایک نظام درکار ہو اور یہ وہ تصوّر ہے جو اس وقت تقریباً سائنسی افسانہ معلوم ہوتا ہے۔"

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تھیوری کا تذکرہ ہو جائے جس کی طرف اجلاس میں ڈاکٹر لائینل ٹائیگر نے اشارہ کیا تھا۔ انھیں یقین ہے کہ جنگ کی طرح کی "اجتماعی جارحیت" ایک مردانہ کام ہے۔ شیرزنوں کے بارے میں کہانیوں کو غلط قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر ٹائیگر نے کہا کہ مجھے کسی تہذیب کا کوئی ایسا مسلّمہ اور مصدّقہ کیس نہیں ملا جہاں عورتیں جنگ آزما ہوئی ہوں یا انھوں نے بڑے جانوروں کا شکار کھیلا ہو۔ جنگ صرف مردوں کے لیے ہے۔ یہ کوئی ہمہ گیر انسانی سرگرمی نہیں۔ جہاں تک نسوانی جارحیت کا تعلق ہے ڈاکٹر ٹائیگر کی رائے میں وہ "اجتماعی" نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر کاپیلو نے اس خیال کا اظہار کیا کہ لاطینی امریکا کی تہذیبوں میں عورتوں کی مسکینی کا راز ہارمونوں میں اتنا مضمر نہیں جتنا شاید اس حقیقت میں ہو کہ انھیں مسلسل سر کی کمی کے اظہار کی تربیت دی گئی ہو۔

ڈاکٹر ہیمبرگ نے وضاحت کی کہ جانوروں کے ساتھ تجرباتی کام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کسی میں مردانہ جنسی ہارمون غیر معمولی طور پر زیادہ مقدار میں ہوں تو اس کا سب سے زیادہ اثر ابتدائی عمر میں ہوتا ہے۔ یہ انسان کے لیے جارحیت "سیکھنا" آسان بناتا ہے اور ایسی صورت

میں ہمیشہ کے لیے بھی، جب ہارمونوں کا توازن نارمل سطح پر آجائے۔

اس سے اجلاس کی توجہ ایک ایسے موضوع پر آئی، جو شاذ ہی نظرانداز ہوتا ہے یعنی تعلیم۔ ڈاکٹر ٹائیگر نے بندروں کے ساتھ جو تجربات کیے ان سے ظاہر ہوا کہ بہت چھوٹے اور کم سن جانوروں کے سامنے صرف ایک مختصر وقت کے لیے خطرناک تصویریں لائی جائیں تو ان کا ردّ عمل چھ مہینے بعد ظاہر ہو گا۔ اس سے ہمیں فوراً ٹیلی وژن کا خیال آتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکا میں بچّے ٹی وی کے سامنے اتنا ہی وقت گزارتے ہیں جتنا اسکول میں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چھ سال کی عمر میں جب وہ کلاسوں میں جانا شروع کرتے ہیں تو اس سے پہلے ٹیلی وژن ہی ان کی تعلیم کا سب سے بڑا عنصر ہوتا ہے۔

تشدّد کے دبستان کی حیثیت سے ٹیلی وژن بہت مو ثر ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر ٹائیگر بتاتے ہیں کہ امریکا میں ٹیلی وژن کی تینوں ملک گیر کمپنیوں کے پروگراموں کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اوسطاً ہر ایک گھنٹے کے بعد ایک قتل دکھایا جاتا ہے اور اگر شام کے ان پروگراموں کی اوسط نکالی جائے جو بہت زیادہ دیکھے جاتے ہیں تو قتل کا منظر ہر آدھے گھنٹے کے بعد نظر آجاتا ہے۔ ہر آٹھ منٹ کے بعد تشدّد کا ایک واقعہ دکھایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ٹائیگر کہتے ہیں کہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس تشدّد کو "منزّہ" بنا دیا جاتا ہے۔ کوئی خون نہیں بہتا، کوئی ناگواری نہیں ہوتی۔ قتل کو اس طرح دکھایا جاتا ہے جیسے مسائل کو حل کرنے کے لیے یہ ایک صاف ستھرا طریقہ ہے۔

بڑے شہر میں ہجوم اسباب

ٹیلی وژن کی سکرین پر تشدّد کا جو طوفان دکھایا جاتا ہے اس کے مقابلے میں تعلیم کیا کر سکتی ہے؟ ڈاکٹر شروڈ واش برن کی رائے میں کچھ زیادہ نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر واش برن نے صاف صاف کہا، "جانوروں کے طرزِ عمل کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی ماحول بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہمارا تعلیمی نظام بدترین ممکن نظام ہے۔ یہ تعلیم کے آغاز میں بہت دیر کر دیتا ہے۔ پھر یہ کھیل کی جگہ نظم و ضبط کو استعمال کرتا ہے۔ انسانوں کی تعلیم کے لیے اس سے بدتر نظام تشکیل دینا مشکل ہے۔ جارحیت سے جو مسائل ابھرتے ہیں ان میں سے بیشتر کی جڑیں تعلیمی نظام ہے۔

انھوں نے اس سختی سے اعلا تعلیم کے نظام کو رگیدا جس نے امریکا اور دوسرے ممالک

میں طلبہ کے ہمہ گیر احتجاج کو جنم دے رکھا ہے۔ انھوں نے کہا" یونی ورسٹیوں کی مصیبت یہ ہے کہ وہاں ایسے لوگ داخل ہیں جو وہاں رہنا نہیں چاہتے"

طلبہ یونی ورسٹیوں میں اس لیے آتے ہیں کہ وہ نوکری کے لیے سرٹیفکیٹ چاہتے ہیں یا زندگی کا ساتھی ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ یا شاید اس لیے کہ ان کے والدین بچپن میں بدسلوکی کے معاوضے کے طور پر انھیں پڑھاتے ہیں۔ پس طلبہ یونی ورسٹیوں میں اس لیے بغاوت کرتے ہیں کہ ان کے لیے یونی ورسٹی میں داخلے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

یہی رجحان بالکل مختلف معاشرے مثلاً بغداد میں بھی ہے۔ ڈاکٹر کمال نے بتایا کہ وہاں طلبہ میں متشدّدانہ جرائم کا تجزیہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ جرائم کا ارتکاب وہ طلبہ کرتے ہیں جن کے والدین شہر ہی میں رہتے ہیں۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ شہر کے باہر سے آنے والے طلبہ کی زندگی میں مقصد زیادہ اور عیش کم ہوتا ہے۔

بہت جلد اجلاس میں یہ بات ظاہر ہوگئی کہ آج کے جارحانہ طرزِ عمل کی ایک دوسرے سے دو لاتعلق مثالوں میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ طلبہ کا احتجاج اور شہروں میں تشدّد کے جرائم دونوں کا تعلق گنجائش سے زیادہ آبادی کے ساتھ بھی کسی حد تک ہو سکتا ہے۔ آج کی بڑی یونی ورسٹی اصل میں شہر ہے۔ ڈاکٹر ہیمبرگ نے کہا کہ دنیا کا اوّلین معلوم شہر مشرقِ وسطیٰ میں اُور نامی شہر تھا۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا اندازہ ہے کہ اس کی آبادی چالیس ہزار تھی۔ اور یہ تعداد یونی ورسٹی اوف کیلیفورنیا کے طلبہ کی تعداد سے آدھی ہے۔

شہروں میں تشدّد کا تذکرہ کیا ہوا بھان متی کا پٹارا کُھل گیا۔ سچ پوچھیے تو اجلاس حقیقت میں ختم نہ ہوا، کیوں کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آیا شہر اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ متشدّد ہیں۔ انھوں نے دعوا کیا کہ جرائم کی بلند شرح اب صرف اس لیے ہمارے سامنے آتی ہے کہ جو بہت سی وارداتیں پہلے رپورٹ نہیں ہوتی تھیں، اب رپورٹ ہو جاتی ہیں، بالخصوص جب ان سے زیادہ خوش حال شہری ملوّث ہوتے ہیں۔

برطانیہ کے ایک عدالتی ماہرِ نفسیات، ڈاکٹر جان گن اجلاس میں مبصّر کی حیثیت سے شریک تھے۔ انھوں نے ٹھیک ٹھیک سائنسی نتائج تک پہنچنے کے لیے جرائم کے ناقص اعداد و شمار کے استعمال کے خطرے کا انتباہ کیا۔ انھوں نے تشکیلِ سیرت کے علم کے ماہرین کے ان نتائج کی صحت میں بھی شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جانور انتہائی جارحیت

یورپ اور شمالی امریکا کے اخبار پڑھنے اور ٹیلے وژن دیکھنے والے معاشرے میں تشدد کے مقام کو خوب سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ابلاغ عامہ والے بھی اس شبہے سے واقف ہیں کہ تشدد پیش کرنے میں کچھ ذمہ داری ان کی بھی ہے۔ یہ شبہ سائنسی نتائج پر مبنی نہیں۔ چنانچہ دو دھڑے ہیں ایک وہ جو ابلاغ عامہ کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، دوسرے وہ جو کہتے ہیں کہ معاشرہ اپنی اصلاح نہیں کر سکتا تو خواہ مخواہ دوسروں کو بدنام کرتا ہے۔

IRON MAN
15¢ 28 AUG
APPROVED BY THE COMICS CODE AUTHORITY
THE INVINCIBLE
IRON MAN
FOOL! YOUR ARMOR CAN'T SAVE YOU FROM THE CONTROLLER!
MARVEL COMICS GROUP

کا مظاہرہ اجنبیوں کے سامنے کرتے ہیں، انھوں نے ماہرین کو یاد دلایا کہ انسان اپنے قرابت داروں سے اس سے بھی زیادہ جارحانہ طرزِ عمل روا رکھتے ہیں۔ پولیس والے سب سے زیادہ اس وقت خوف زدہ ہوتے ہیں جب ان سے کہا جاتا ہے کہ کسی متشدّد خاندانی جھگڑے میں مداخلت کریں۔

ترقی پذیر دنیا کا مسئلہ

ترقی پذیر دنیا میں یہ مسئلہ ایک مختلف سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ ڈاکٹر کمال نے بتایا کہ بغداد میں متشدّد جرائم کی وارداتیں سب سے زیادہ اُن لوگوں میں ہوتی ہیں جو دیہاتی علاقوں سے منتقل ہو کر شہر میں آبسے ہیں اور جو شہر کی دو ملیون آبادی کے نصف پر مشتمل ہیں۔ شہر کے اُن نوآبادکاروں میں جرائم کی شرح سب سے کم ہے جو دیہات سے آنے والوں کی مخصوص بستیوں کی جگہ اصلی شہریوں کے پڑوس میں رہتے ہیں۔

یہی کہانی کلکتے کے یونی ورسٹی سائنس کالج کے شعبۂ نفسیات کے استاد ڈاکٹر شِب کے مِترا نے سنائی۔ انھوں نے بتایا کہ میرے شہر میں بھی جرائم کی تعداد بڑھ رہی ہے، لیکن اس کا سبب اس کے شہریوں کے ہجوموں کی "گم نامی" ہے۔ ایک بڑے شہر میں گاؤں سے آنے والا انسان اپنی اصلیت کھو بیٹھتا ہے۔ یہی لوگ گم شدہ ارواح بن جاتے ہیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی ایک وجہ یونی ورسٹی اوف انڈونیشیا کی فیکلٹی اوف مڈیسن کے شعبۂ تحلیلِ نفسی کے استاد ڈاکٹر ڈی۔ بی۔ لوبس نے بتائی۔ انھوں نے کہا کہ انڈونیشیا جیسے ملکوں میں ایک بڑا شہر مغربی ثقافت کا مرکز ہوتا ہے۔ جب کسان اپنا گھر بار چھوڑ کر جکارتا میں آ جاتا ہے تو وہ صرف گاؤں سے شہر کو منتقل نہیں ہوتا بلکہ ایک بالکل نئی ثقافت کا سامنا کرتا ہے۔

ایسا صرف دیہاتی باشندوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔ آج کے شہر اس تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ ان کے اپنے فرزند پریشان ہو جاتے ہیں اور پرانے اندازِ زندگی سے کٹ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈیلگاڈو نے شہریوں کے اس تجدیدی پروگرام کا ذکر کیا جس پر ژیل یونی ورسٹی کے مرکز نیو ہیون میں عمل ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا، "اب شہر خوب صورت ہے اور جدید ہے، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا ذاتی تشخص گم ہو گیا ہے۔ اب میں گلیوں میں رنگ برنگ لباس میں

خانہ بدوش نہیں دیکھتا۔ مجھے وہ پرانا نیگرو چرچ نظر نہیں آتا جس سے پیانو کی آواز آتی تھی۔ میری تو ساری تاریخ چوری ہو گئی ہے۔"

بے شک شہر شہر میں فرق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کن بوڈاپسٹ کے دفاع پر ثابت قدم رہے جہاں ان کے قول کے مطابق متشدد جرائم کی شرح ہنگری کے دور افتادہ دیہات کی شرح سے بھی کم ہے۔ ڈاکٹر ہیمبرگ نے تجویز پیش کی کہ اگر کوئی ایسی تحقیق کی جائے کہ شہروں کا زیادہ سے زیادہ رقبہ کتنا ہونا چاہیے تو یہ مفید رہے گی۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم لوگ شہری تہذیب سے بھی اتنی ہی عدم مطابقت رکھتے ہیں جتنی صنعتی تہذیب سے۔ ۱۸۰۰ء سے پہلے جب یورپی آبادی کا صرف دو اعشاریہ دو فی صد شہروں میں رہتا تھا، کوئی معاشرہ شہری نہیں بنا تھا۔ بلکہ ۱۹۰۰ء تک بھی صرف برطانیۂ عظمیٰ کو شہر اڈزدہ معاشرہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ "ہم ایک ایسی صورت سے چلے جب کوئی شخص شہر میں بسنا پسند نہیں کرتا تھا اور اب ایسے مرحلے میں ہیں جب ہر شخص کا رجحان یہی ہے کہ شہر میں آباد ہو جائے۔"

اس مسئلے پر کچھ کام پہلے ہی ہو چکا ہے کہ آیا بڑے شہر واقعی انسانوں کے رویے کو غیر انسانی بنا دیتے ہیں۔ اسٹینفورڈ یونی ورسٹی کے ایک محقق ڈاکٹر فلپ زمبارڈو نے دو کاریں خریدیں۔ اس نے ان کاروں کے ہڈ کھول دیے اور لائسنس پلیٹیں اتار لیں۔ تین دن کے لیے ایک کار کیلے فورنیا کے شہر پالو آلٹو میں اسٹینفورڈ کے سامنے رکھ دی اور دوسری نشیبی مین ہٹن میں نیویارک یونی ورسٹی سے آگے۔

پالو آلٹو شہر میں، جس کی آبادی صرف پچاس ہزار ہے، کار کو کچھ نہ ہوا۔ بارش کا طوفان آیا تو بعض مہربان راہ گیروں نے دھکا دے کر اسے چھت کے نیچے کر دیا۔ نیویارک میں ڈاکٹر زمبارڈو کے مشاہدین نے دیکھا کہ جس وقت کار گلی میں رکھی گئی اس کے سات منٹ کے اندر اندر اسے نقصان پہنچا دیا گیا۔ تجربے کے اختتام پر کار کا محض ننگا بچا ڈھانچا رہ گیا۔ زیادہ تر نقصان دن دہاڑے پہنچایا گیا اور وہ بھی سفید فام درمیانہ طبقے کے خوش لباس افراد کے ہاتھوں۔

اس کا سبب کیا ہے؟ بڑے شہر میں گُم نامی کا عنصر ہے۔ نیویارک کے جن لوگوں نے کار کو نقصان پہنچایا انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ایک تو وہ مالک کو نہیں جانتے، دوسرے جو راہ گیر سامنے سے گذرے انھیں وہ کبھی دوبارہ نہیں دیکھیں گے۔

اب ڈاکٹر ہیمبرگ کا مذکورہ ایک اور تجربہ ملاحظہ ہو۔ چار طلبہ نے لوگوں کے گھروں پر دستک

دے کر پوچھا کہ آیا وہ ٹیلی فون استعمال کر سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ آزمائش ایک تو نیویارک میں کی اور دوسرے اس شہر کے قریب ساٹھ ہزار آبادی کے ایک قصبے میں۔ ان کے لیے کسی گھر میں داخلے کے مواقع چھوٹے قصبے میں پانچ گنا تھے۔ نیویارک شہر میں جن لوگوں کے مکانوں پر دستک کی گھنٹی بجائی گئی۔ ان میں سے پچھتر فی صد بند دروازوں ہی سے چلّائے یا کسی چھوٹے سے دریچے سے۔ چھوٹے قصبے میں پچھتر فی صد لوگوں نے گھر کے دروازے کھولے۔

ڈاکٹر ہمبرگ نے کہا، "ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ شہروں میں اجنبیوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ ہر روز لوگوں کا سامنا ایسے اجنبیوں سے ہوتا ہے جو انھیں دوبارہ کبھی نظر نہیں آئیں گے۔ اور جن کے ساتھ مسابقت ہوتی ہے تو پارکنگ کی جگہ سے لے کر جنسی ساتھی تک کے مختصر کاموں میں۔"

قدرتی سائنسوں کے تمام نمائندوں۔ تشکیلِ سیرت کے علم کے ماہرین، ماہرینِ عمرانیات اور ماہرینِ نفسیات۔ نے اپنی تحقیق سے جو نتائج اخذ کیے، انھیں کیسے اور کیوں حقیقی دنیا میں نافذ کیا جائے؟ یہ تھا وہ سوال جو ماسکو (سوویٹ یونین) کے بین الاقوامی مزدور تحریک کے ادارے کے ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر نکوس کوداسکی نے اٹھایا۔ ڈاکٹر کوداسکی چاہتے تھے کہ جارحیت کے پس پردہ کارفرما معاشرتی عناصر پر بہت زیادہ زور دیا جائے۔ انھوں نے ان عناصر کو تین حصّوں میں منقسم کیا۔ افراد، قومی معاشرے، اور بین الاقوامی دنیا۔ انھوں نے ایسے خطرات کے بارے میں بھی انتباہ کیا جو اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے حیاتی پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

کلب سے میگا بم تک

معاشرتی اور قدرتی علوم کے درمیان قلابہ مہیا کیا تو ڈاکٹر اول ہولسٹی نے، جو وینکوور میں برٹش کولمبیا یونی ورسٹی میں علم السیاست کے پروفیسر ہیں، انھوں نے اس تحقیقی کام کی رُوداد پیش کی جو بندروں اور چوہوں پر نہیں بلکہ ایسے انسانوں پر کیا جو کھنچاؤ کی کیفیت میں تھے۔ ان میں تاریخی حالات سے دوچار سیاست داں بھی شامل تھے۔

ڈاکٹر ہولسٹی کی دل چسپی یہ معلوم کرنے میں تھی کہ ان لوگوں پر پریشانی یا کھنچاؤ کے عالم میں کیا گزرتی ہے جنھیں ایسے فیصلے کرنے ہوتے ہیں جو آخری جارحانہ عمل یعنی جنگ پر منتج ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے پہلے یہ بتایا کہ ایسی صورتِ حال میں سیاست داں جو کچھ کرتے ہیں اس کی جسمانی بنیاد بھی ہوتی ہے۔ انسانوں میں معلومات کی چھان پھٹک کی
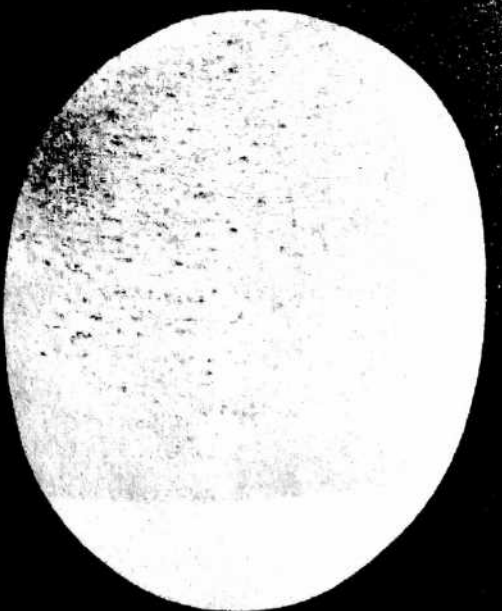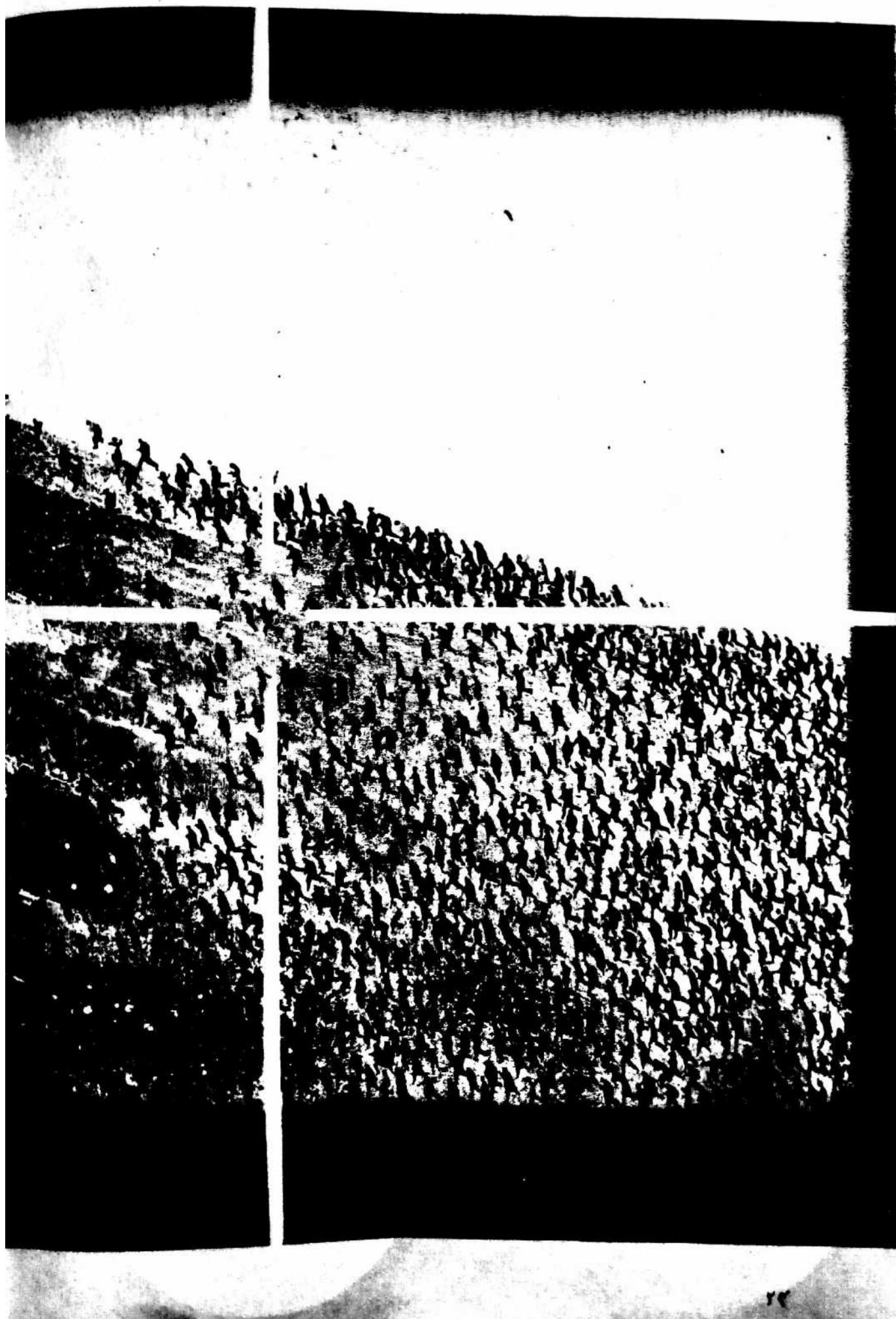
کوئی غیر منقسم صلاحیت نہیں ہوتی۔ ان کے ذہن میں
ایک وقت میں تقریباً سات معاملات رہ سکتے ہیں۔ ان

ہسپانوی مصوّر جوآن جی نوورز کی پرکشش تصاویر تشدد کی ہر صورت، یعنی ظلم اور وحشیانہ پن سے جنگ، قتل، انسان کے ہاتھوں زندہ چیزوں کی بے مقصد غارت گری کی مذمت کی مظہر ہیں۔ ان موضوعات پر اس کی متنوع تصویر کشی انسان کے ہاتھوں انسان کے ساتھ غیر انسانی سلوک اور خود بربادی کی بڑھتی ہوئی صلاحیت کی مذمت کی حامل ہے۔ بعض تصاویر میں جی نوورز جنگی مشینوں سے انسانوں کا شکار دکھاتا ہے (دائیں جانب کی تصویر دکھاتی ہے کہ ایک ہتھیار کو دیکھ کر خوف زدہ ہجوم بچنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہیں) اور دوسری تصاویر میں (اگلے صفحے پر) وہ دکھاتا ہے کہ لوگ کسی بے نام خطرے سے ڈر کر بھاگ رہے ہیں۔ پچھلے صفحے پر چھے حصّوں میں منقسم جو لرزا دینے والی تصویر درج ہے اس میں دو ننھے منّے انسانی اجسام ایک سپاٹ ریگستان میں لاچاری اور مجبوری کے عالم میں بھاگ رہے ہیں جو آخر کار کٹ مرتے ہیں۔ بہت جلد قاتلوں کے نقوشِ پا غائب ہو جاتے ہیں، اور اس کے بعد اجسام بھی نابود ہو جاتے ہیں۔ گویا ایسا قتل جس کے کوئی آثار باقی نہیں رہے۔ مصوّر نے یہ پیغام چھوڑا ہے کہ بے یار و مددگار اور بے چہرہ مظلوم اور انفرادی اجسام یا بھاگتے ہوئے عوام اب تک پریشان کیے جا رہے ہیں اور وہ تعاقب کا شکار ہیں۔

فوٹوز بہ شکریہ۔ مارل بارو فائن آرٹ لندن۔
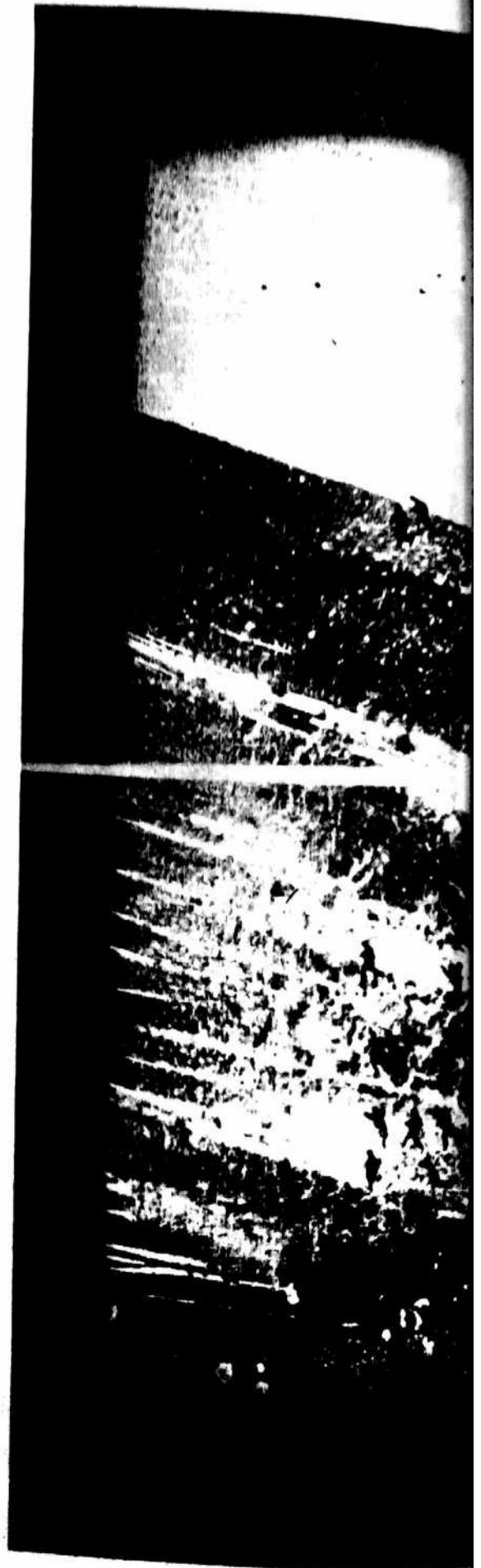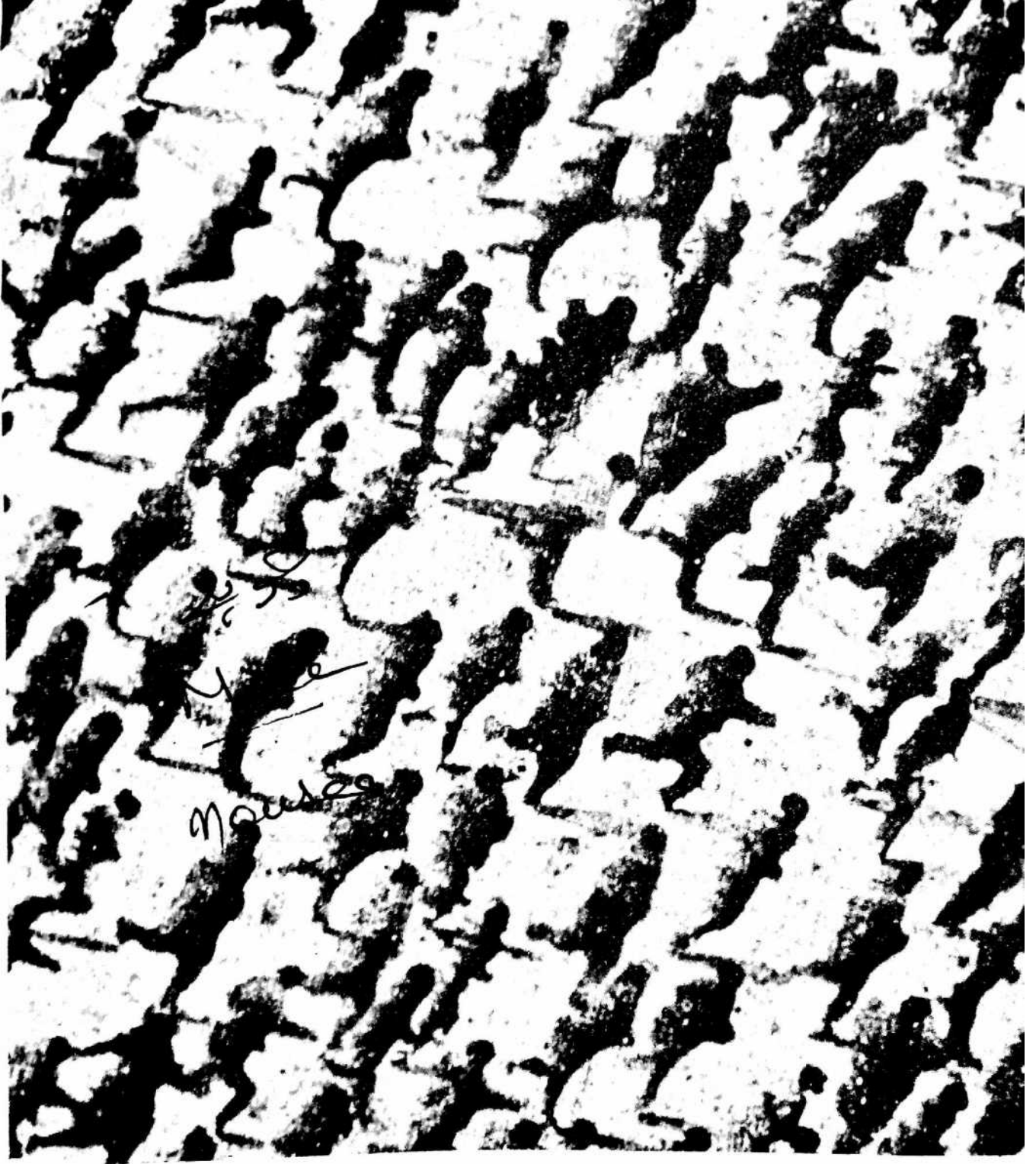
میں سے دو ایک معاملات اِدھر اُدھر ہو سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دباؤ کے تابع غلطیاں بھی کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر نے یہ نکتہ پیش کیا کہ ایک معالج کو اس صورت میں غیر معمولی قرار دیا جاتا ہے کہ وہ اسّی یا نوّے فی صد مریضوں کا علاج کامیابی سے کر لے، لیکن ایسا ریکارڈ اُن سیاست دانوں کے لیے کافی نہیں جو ایٹمی میزائل کے دور میں جنگ سے گریز کی سعی میں مصروف ہوں۔ تازہ ترین علمی نتائج کی رُو سے جنگ کسی ہٹلر کی پیدا کردہ مرضیاتی صورت نہیں ہوتی، نارمل افراد بھی کھنچاؤ کے عالم میں غیر عقلی فیصلے کر سکتے ہیں۔

کسی قدر کھنچاؤ ایک اچھی چیز ہے اور درمیانی سطح پر یہ کارکردگی کو بہتر بنا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ہولسٹی نے ایک فرضی ہنگامی صورتِ حالات کی یہ مثال پیش کی کہ ایک شہر سیلاب کی زد میں آنے والا ہے اور شہریوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ شہر کو بچانے کے لیے ریت کی بوریاں بھریں اور انھیں ایک دوسرے کے اُوپر رکھیں۔ یہ ایک آسان کام ہے اور لوگ کھنچاؤ کے تحت جسمانی محنت بغیر تھکے زیادہ دیر تک کر سکتے ہیں۔

لیکن ایک بحران کے دوران میں فیصلے کرنے کے لیے مختلف قسم کے ہنر درکار ہیں۔ تجربات ظاہر کرتے ہیں کہ ایسی صورتِ حالات میں ان ہنروں کی سطح میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ کھنچاؤ کے تحت افراد کو "کوئی چیز سیاہ نظر آتی ہے یا سفید، لیکن بھورے رنگ کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ وہ ان امور کا مظاہرہ کرتے ہیں" زبانی کارکردگی میں کمی، غلطی کی اضافہ شدہ شرح، ابہام کے لیے برداشت میں کمی، مجرّد صلاحیت کا ضیاع اور نظری اور حرکی کی ہم آہنگی کا انتشار"۔ جب ڈاکٹر ہولسٹی نے یہ فہرست پڑھی تو کچھ سامعین سوچتے تھے کہ جو افراد ایسی حالت میں ہوں انھیں تو کار بھی چلانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے چہ جائے کہ وہ مملکت کے جہاز کی ملاحی کریں۔

بدترین کھنچاؤ وقت کا ہوتا ہے۔ سیاست داں پر دباؤ ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے لام بندی کرے اور جب فریقِ ثانی کے پاس ایٹمی میزائل موجود ہو تو ایسا تاثر نہ پیدا ہونے دے کہ جوڑ برابر کا رہا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خطرہ حقیقی ہے یا نہیں" اگر وہ یقین رکھتا ہے کہ فلاں چیز صحیح ہے تو یہ بات اس سے زیادہ اہم ہے کہ وہ واقعی صحیح ہے"۔

۱۹۱۴ء کے موسمِ گرما میں جب مقامی بحرانوں کا نتیجہ پہلی عالمی جنگ کی صورت میں نکلا تو سیاست داں محسوس کرتے تھے کہ انھیں لام بندی میں دوسروں سے آگے ہونا چاہیے۔ فرانس اور جرمنی کی لام بندیوں میں صرف پانچ منٹ کا فرق رہا۔ متبادل راستہ تجویز کرنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر ہولسٹی کے بیان کے مطابق زبردست کھنچاؤ ہو تو انسان اس قابل بھی نہیں رہتا کہ گزرتے ہوئے وقت کو محسوس کر سکے۔

کھنچاؤ انسان کو مجبور کرتا ہے کہ پوری توجہ فوری مستقبل پر مرتکز کر دے اور مستقبلِ بعید کا خیال نہ کرے۔ ڈاکٹر ہولسٹی نے کہا، "یہ ڈوبتے آدمی کا مسئلہ ہے۔ آپ پہلے ہی چاہتے ہیں کہ کسی طرح وہ سانس لینے کے قابل ہو۔ اس وقت یہ نہیں سوچتے کہ کہیں وہ نمونیا کا شکار نہ ہو جائے"۔ اس کے ساتھ ہی موصوف نے کہا، "بدقسمتی سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تھوڑے عرصے کے فوائد طویل عرصے کے نقصانات ہوں"۔

بحران کے زمانوں میں سیاست دانوں کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ ان معلومات کو نظر انداز کر دیں جو ان کی اپنی آرا سے لگا نہ کھائیں، اوّل تو کسی سے مشورہ نہ لیا جائے اور اگر لیا جائے تو مشیروں کی محدود تعداد سے۔ پہلی عالمی جنگ کا حوالہ

دیتے ہوئے ڈاکٹر ہوسٹی نے بتایا کہ جرمنی کا حاکم قیصر یہ فرض کرنا چاہتا تھا کہ برطانیہ جنگ سے باہر رہے گا۔ اس کے سفیر متعینہ لندن نے اپنی رپورٹ میں انتباہ کیا کہ برطانیہ کی غیر جانب داری پر تکیہ نہ کیا جائے۔ اس رپورٹ کے حاشیے پر قیصر نے لکھا، "اس بوڑھے احمق کی اطلاع پر یقین نہیں کرنا چاہیے"۔ قیصر کو روس میں اپنا سفیر زیادہ پسند تھا، کیوں کہ وہ اُسے ایسی بات بتا رہا تھا جو قیصر سننا چاہتا تھا۔ یعنی زارِ روس کبھی سربیا کے مسئلے پر اعلانِ جنگ نہیں کرے گا۔

اس کے بعد ڈاکٹر ہوسٹی دوسری عالمی جنگ کے قریبی وقت پر آئے۔ برطانیہ کے مستقل انڈر سیکرٹری برائے امورِ خارجہ رابرٹ وین اسٹارٹ اس بات پر زور دیتے رہے کہ سوویٹ فوج پولش فوج سے کم زور نہیں اور یہ کہ ہٹلر چیکوسلوواکیا کے محض ایک ٹکڑے سے مطمئن نہیں ہوگا۔ انھیں یقین تھا کہ کوئی اُن کی یادداشتیں پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ انھوں نے جان بوجھ کر ایک مرتبہ صفحات آگے پیچھے کر دیے۔ یہ صفحات اسی صورت میں اُن کے پاس واپس آگئے اور اُن پر ایسے دستخط موجود تھے جن کا مطلب یہ تھا کہ انھیں پڑھ لیا گیا ہے۔

حسبِ معمول ڈاکٹر کن خود اپنے ماضی کی آواز سے بولے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں ہنگری کی آزادی کے لیے مزاحمتی تحریک میں شامل تھے۔ اور کہنے لگے، "جنگ کے خاتمے کے قریب کھنچاؤ بہت زیادہ تھا۔ بوڈاپسٹ کی گلیاں نعشوں سے اَٹی پڑی تھیں۔ ہم خفیہ کارکنوں کا رابطہ ایک دوسرے سے باقی نہیں رہا تھا۔ میری ذمّے داریوں میں یہ چیز بھی شامل تھی کہ ان چار سو یہودی بچّوں کی جانیں بچاؤں جنھیں چھپایا ہوا تھا۔ انھیں خوراک مہیا کرنی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ کھنچاؤ کے دوران میں کارکردگی بہترین رہی۔ آج میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ اس زمانے میں میں نے کس طرح اپنا فرض ادا کیا۔"

ڈاکٹر ہمبرگ نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ بعض مطالعوں سے یہ مترشّح ہوتا ہے کہ بعض لوگوں میں کھنچاؤ اعلا تخلیقی قوّت پیدا کر دیتا ہے، لیکن یہ کلیّہ سب پر صادق نہیں آتا۔ ڈاکٹر ہوسٹی نے حالیہ عالمی تاریخ سے اخذ کردہ اسباق کی بنا پر ڈاکٹر ہمبرگ سے اتفاق کیا، لیکن انھوں نے کہا کہ ان سے سب سے بڑا سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا کیا جا سکتا ہے؟ اُن کی رائے میں اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ وقت حاصل کیا جائے۔

ڈاکٹر ہوسٹی نے ۱۹۱۴ء کے موسمِ گرما کا ذکر کیا جب ابلاغ میں عظیم اضافہ ہوا تھا، لیکن اپنے دشمنوں کے ساتھ ابلاغ میں نہیں۔ انھوں نے اس زمانے کا موازنہ ۱۹۶۲ء میں کیوبا کے میزائلی بحران سے کیا۔ انھوں نے بتایا کہ صدر کینیڈی نے بڑی کوشش کی کہ فیصلے کرنے سے پہلے متبادل نقطہ ہائے نگاہ معلوم کر لیں بلکہ وہ تبادلِ خیال کے وقت بعض اوقات مذاکرات سے غیر حاضر بھی ہو گئے۔ کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ صدر کی حیثیت سے ان کی موجودگی آزادانہ اظہارِ رائے میں حائل ہو سکتی ہے۔

جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ امریکی جہاز پیچھے ہٹا لیے جائیں تاکہ سوویٹ جہازوں کو زیادہ وقت مل جائے، تو یہ پیغام خفیہ کوڈ میں نہیں بھیجا گیا بلکہ اس کی ترسیل واضح انداز میں کی گئی تاکہ اِسے سُنا جا سکے۔ ڈاکٹر ہوسٹی نے کہا کہ اس طرح راستے

میں سنے جانے والے پیغامات کسی واضح پبلک بیان سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔ موصوف نے کہا، "میں یقیناً امید کرتا ہوں کہ دنیا کو کیوبا کے میزائلی بحران کی طرح کے ایک اور بحران سے نہیں گزرنا پڑے گا، لیکن اس سے ثابت ہو گیا کہ ایسی صورتِ حال میں اس بات سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے کہ انسان کھنچاؤ کے وقت کیا کرتا ہے۔"

ڈاکٹر ہوسٹی اس مسلّمہ خیال سے متفق نہیں تھے کہ جو لوگ کھنچاؤ کو برداشت نہیں کر سکتے وہ سیاست میں راستے ہی میں پٹ جاتے ہیں۔ اسی عمل کو صدر ٹرومین نے اس مشہور فقرے میں سمویا تھا کہ "اگر تم گرمی برداشت نہیں کر سکتے تو باورچی خانے سے نکل جاؤ۔" ڈاکٹر ہوسٹی نے کہا، "آج سیاسی اقتدار کے حصول کے لیے نئے راستے موجود ہیں۔ اگر ہمیں ان لوگوں کو نکالنا ہے جو کھنچاؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو ہم سیاسی پیش رفت کے عمومی انداز پر انحصار نہیں کر سکتے۔"

ہم انسانی ارتقا کے لیے ایک قوت کے طور پر جنگ پر بھی انحصار جاری نہیں رکھ سکتے۔ یہ یاد دہانی ڈاکٹر رابرٹ بگ لو کی طرف سے آئی جو کرائسٹ چرچ (نیوزی لینڈ) کی یونی ورسٹی اوف کینٹربری کے شعبۂ حیوانیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر بگ لو ایک کتاب "صبح کے جنگ آزما" کے مصنف ہیں، جس میں انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ جنگ نے انسان کے نشو و ارتقا میں بنیادی حصہ لیا ہے۔

زمانہ قبل از تاریخ میں اوّلین انسانی معاشروں نے زمین کے لیے ایک دوسرے کا مقابلہ کیا۔ گروہوں کے اندر افراد کو دفاع کے لیے باہم تعاون کرنا پڑا۔ انھیں ابلاغ کے لیے نشانات اور علامات کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر بگ لو نے کہا، "جن گروہوں میں داخلی تعاون موجود تھا انھوں نے نیا علاقہ حاصل کر لیا اور سب سے کام یاب گروہوں کو ہلاک کر کے ختم کر دیا۔ دس بیس لاکھ برسوں کے اندر انسانی دماغ کا حجم تگنا ہو گیا اور اس نسبت سے انسان میں ابلاغ کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوا۔"

"انسانی تعاون کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا۔ میرے نزدیک عالمی تعاون حاصل کرنے کے لیے اب ہمیں صرف ایک یا دو قدم آگے بڑھانے ہیں۔ ہم مسابقت کو ختم نہیں کر سکتے، لیکن ہمارے لیے یہ امید کرنے کا اچھا سبب موجود ہے کہ ہم پرانے زمانے کی جنگ کو زائد المیعاد اور متروک بنا سکتے ہیں، خواہ ماضی میں یہ جنگ ہی تھی جس نے ہمیں تعاون پر مجبور کر دیا۔ اگر ہم ایٹمی ہتھیاروں کے ذریعہ سے نوعِ انسانی کو نابود نہیں کرنا چاہتے تو عالمی تعاون ناگزیر ہے، خواہ اس لیے ہمیں دو یا تین صدیوں کے تاریک دور سے گزرنا پڑے۔"

دماغی ڈھانچے میں تبدیلیوں کے لیے وقت کے جس پیمانے کا ذکر ڈاکٹر بگ لو نے کیا تھا اسے ایک بار پھر ڈاکٹر داش برن نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اوّلین انسان کی دماغی صلاحیت دو یا تین ملین سال تک جوں کی توں رہی۔ اس عرصے کے دوران میں پتھر کے ان اوزاروں میں بھی ارتقا نہ ہوا جو وہ بناتا رہا۔

"پھر سات لاکھ سال قبل ایک بہت مختلف قسم کا اوزار نمودار ہوا۔ اوّلیں اوزار تو کوئی بے وقوف انسان بھی بنا سکتا تھا، لیکن تجربات سے ظاہر ہوا ہے کہ گریجویٹ طلبہ دس ہفتے کے لیبورٹری کام کے بعد بھی وہ اوزار دوبارہ بنانے میں کام یاب نہیں ہو سکتے جو انسان نے بعد میں بنائے۔ انسانی دماغ پہلے سے دوگنا بڑا ہوگیا تھا۔ اس کے پاس ہنر کا ایک نیا سلسلہ آگیا۔ وہ آگ سے واقف تھا۔ وہ بڑے بڑے جانور شکار کرتا تھا۔ پرانی دنیا میں چین سے لے کر انگلستان تک انسان کی ایک ہی قسم آباد تھی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ چالیس ہزار سال پہلے حالات ایک بار پھر بدل گئے۔ اس دور میں ہم مختلف اوزار دیکھتے ہیں اور یہی وہ وقت تھا جب آج کی زبانوں کی جڑیں ظاہر ہوئی ہوں گی۔ اگر آپ جاوا کے آدمی کو ہمارے اسکول کے نظام میں ڈال دیں تو وہ آگے نہیں بڑھ سکے گا، لیکن بعد کا نینڈرتھال انسان کالج بھی جا سکے گا۔"

بہ ظاہر ہم پھر اسی جگہ آگئے ہیں جہاں سے ہم تاریخ کا پردہ اٹھتے وقت چلے تھے، بہر حال بالکل ہی طرح نہیں۔ انسان پہلے کی طرح جارحیت پسند ہیں، لیکن اب ہم ڈنڈے نہیں میگا بم اٹھائے پھرتے ہیں۔ اگر ہمیں زندہ ہی رہنا ہے تو ہم ایک ہی دھرّے پر نہیں رہ سکتے۔ ہم ڈاکٹر واش برن کا یہ قول دہراتے ہیں کہ "انسان کو حالات میں ڈھلنا چاہیے۔ جو انواع حالات میں نہیں ڈھلے، وہ نابود ہیں۔"

پُرامن مستقبل کے لیے حل

انسانی جارحیت پر مذاکرات کے خاتمے پر ڈاکٹر ہمبرگ نے انسان کے کسی سانچے میں ڈھلنے کے امکانات کا تجزیہ کیا۔ انھوں نے ان نتائج کا خلاصہ کیا جن پر وہ اور ان کے ساتھی انفرادی اور گروہی جارحیت کی بنیاد پر اور اس بارے میں کچھ کرنے کے امکان کے سلسلے میں پہنچے تھے۔

ان کا ابتدائی مفروضہ رجائیت پر مبنی تھا: "جارحانہ رواج اگرچہ حیاتی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں، انھیں بدلا جا سکتا ہے، لیکن آسانی سے نہیں۔ اگر اس طرح جارحیت میں کمی ہوتی ہے تو دوسری اقسام کی تعمیری سرگرمی ممکن ہو جاتی ہے۔ یہ کام تعلیم کا ہے جسے نہ صرف یہ سکھانا چاہیے کہ تشدد بری چیز ہے بلکہ یہ بھی کہ جذبات سے بھرپور کسی صورتِ حال میں مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے دوسرے طریقے بھی موجود ہیں۔"

انھوں نے کہا کہ بحث کے دوران میں انفرادی جارحیت کی طرف لے جانے والی صورتِ حال

کی چار بڑی قسمیں ابھری ہیں: بقا کے لیے واضح اور موجود خطرہ، خود داری کو ٹھیس، گہرے ذاتی رابطے کے لیے خطرہ، اور ایک عظیم تر گروہ سے وابستگی کے احساس کو خطرہ۔

ڈاکٹر ہمبرگ بڑی شدت کے ساتھ ان اثرات پر نکتہ چینی کرتے رہے جو ٹی وی کے خوں ریزی اور تشدد پر مبنی پروگراموں سے نوعمر ذہنوں پر ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے یہ بھی کہا کہ ٹی وی ایک نہایت امید افزا آلہ بھی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بتایا کہ جب اپولو۔ ۱۲ اپنے واپسی کے سفر پر تھا تو میں اسٹاک ہوم کے ایک ہوٹل کی لابی میں دنیا کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے ایک سو افراد کے ساتھ ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ سب افراد میں ایک اتحاد کی سی کیفیت ہے۔ انھوں نے کہا:

"ٹی وی میں انسانوں کو مربوط کرنے کی جو صلاحیت موجود ہے وہ مجھ پر کبھی اتنے واضح انداز میں واشگاف نہیں ہوئی تھی ... لیکن غالباً ٹی وی کے ایسے استعمال کے لیے ضروری نہیں کہ خلائی مسافر موت کے قریب رہیں۔"

فوری اقدام کے طور پر انھوں نے سفارش کی کہ ابلاغ عام کے وسائل جارحیت کا تاریک پہلو دکھائیں۔ "اگر ٹی وی کو جارحیت میں کمی کا اثر دکھانا ہے تو پھر تشدد کو بد ذوقی کا حامل ظاہر کرنا چاہیے۔"

اس کے بعد انھوں نے مسئلے کے مثبت پہلو پر نظر ڈالی، اجلاس میں سائنس دانوں نے اپنے بہت سے پیش رووں کی طرح اس امر پر اتفاق کیا کہ جارحیت کا کوئی نعم البدل دریافت کیا جائے۔ ڈاکٹر ہمبرگ نے ان کے احساسات کو یوں پیش کیا، "اگر نوجوان مردوں میں اپنے آپ پر فخر کو نمو دینے کے لیے اب شکار اور جنگ آزما سرگرمی مناسب نہیں رہی تو پھر کچھ اور ہونا چاہیے۔" انھوں نے تجویز پیش کی کہ بچوں کو یہ دیکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں کہ ان کے باپ اپنی روزی کے حصول کے لیے کیا کرتے ہیں تاکہ ان کے سامنے نشانہ باز کاؤبوائے یا پردۂ سیمیں پر دکھائے جانے والے مجرم "نمونے کے مرد" کی حیثیت سے نہ آئیں۔

ڈاکٹر ہمبرگ کے بعد ڈاکٹر مکامی نان مکاگیان سر بولے جو انڈونیشیا کے ایک ماہرِ علوم عمرانی ہیں اور اب پیرس میں یونیسکو کے ادارے سے منسلک ہیں۔ انھوں نے یہ بات واضح کی کہ مسئلہ افراد سے آگے جاتا ہے۔ "ہمیں ایسے اداروں کو بدلنا چاہیے جو اس قسم کی صورتِ حال پیدا کرتے ہیں جن میں بقا کے لیے انسان کو جارحیت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔" اور موصوف نے مثال کے طور پر اپنا تازہ تجربہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں انڈونیشیا سے چلا، جہاں خاندان مہد سے لحد تک کا تحفظ فراہم کرتا ہے

اور زبان میں اتنے فرق موجود ہیں کہ کم تجربہ کار ہونے کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ میں کار میں پیرس پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ میں پیرس میں کبھی کار نہیں چلا سکوں گا، لیکن میں نے کار چلائی۔ میں پیرس کے بعض ڈرائیوروں کے برابر جارح ہو گیا۔

سیاسی سائنس داں ڈاکٹر ہولسٹی نے اس رائے کو یوں عالمی منظر پر منطبق کر دیا، "موجودہ بین الاقوامی نظام میں ہم ایسے ہی قواعد کے ماتحت عمل کرتے ہیں جیسے پیرس میں ڈرائیونگ کے سلسلے میں نافذ ہیں۔ یہ فرض کر لینے کی ضرورت نہیں کہ دوسرے جارحیت پسند ہیں اور اگر ہم یہ فرض کر لیں تو اس سے کوئی نظام اتنا ہی خطرناک ہو سکتا ہے، جتنا خطرناک بعض اوقات پیرس کی ٹریفک کا نظام نظر آتا ہے۔"

ڈاکٹر ہمبرگ نے اپنے نتائج میں اسی کو گروہی جارحیت کی جڑ قرار دیا اور تجویز کیا کہ "انسانی دماغ کی اس بصیرتِ فن پر تحقیق کی جائے جو گروہ کے باہر کے افراد کو نقصان پہنچانے کے لیے جواز مہیا کرتی ہے۔" یہ جواز عام طور پر تین وجوہ پر مبنی ہوتے ہیں، نقصان، جو، "وہ"، ہمیں پہنچا سکتے ہیں۔ وہ نقصان، جو ہمارے نہ روکنے کی صورت میں "وہ" اپنے آپ کو پہنچا سکتے ہیں۔ اور یہ یقین کہ "دوسرے" اصلاً انسان درست نہیں ہیں۔

ڈاکٹر ہمبرگ نے کہا کہ ان عقائد کے بارے میں غیر معمولی بات یہ ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظاموں کی ایک بڑی تعداد انھیں تخلیق کر سکتی ہے۔ ترقی صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے جب اس بات کو عام طور پر تسلیم کیا جائے کہ صرف دوسرے ساتھی ہی کے نہیں بلکہ تمام معاشرے خطرناک ہیں۔ "انسان امکانی طور پر ایک ایسا متشدد جانور ہے جو امکانی طور پر متشدد معاشروں کی صورت میں منظم ہے۔"

ڈاکٹر ہمبرگ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر ہم اپنے بارے میں یہ سوچ سکیں کہ ہم ایک ہی نوعِ انسانی سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر ہم ثقافتوں کے اختلاف کا احترام کرتے ہوئے اپنے آپ کا ایک عالمی نوعِ انسانی سے تشخص کر سکیں تو ہمیں اپنی بقا کا بہت بڑا موقعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ شاید خاندان انسانی خاندان کے لیے ایک نمونہ بن سکے، لیکن جیسا کہ اجلاس کے شرکا پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں لوگوں کی ایک چھوٹی سی تعداد کی آگہی کو توسیع دے کر عالمی برادری کی آگہی میں بدلنا مشکل ہے۔

ڈاکٹر ہمبرگ اور دوسرے شرکا نے محسوس کیا کہ ساری دنیا کو باہم متحد کرنے اور ایک ہی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک "بہت بڑے معین نصب العین" کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ

نوعِ انسانی کے لیے خطرہ موثر ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم بیس سال نیستی کے سائے میں رہے ہیں، لیکن ہمارے سیاست داں ابھی تک انیسویں صدی کی اصطلاحات میں گفت گو فرما رہے ہیں۔ ایٹمی جنگ کے خطرے کو ٹالنے کے لیے ہمیں غالباً ایک سو برس کی ضرورت ہے، لیکن کیا ہمیں باقی کے اسی سال مل جائیں گے ؟"

ان کے نزدیک زیادہ فوری امید اس بات میں مضمر ہے کہ ایک سے زیادہ گروہوں کی رکنیت کا سلسلہ چلے، تاکہ لوگ ایک سے زیادہ وفاداریوں میں بندھے ہوں۔ تجارت، صنعت اور بین الاقوامی جماعتیں یہ صورت مہیا کرسکتی ہیں۔ ڈاکٹر ہمبرگ کے نزدیک اس کی ایک اچھی مثال یہ ہے کہ یونی ورسٹیوں کے پرانے طلبہ بحران کے دور میں، طلبہ اور اساتذہ کے درمیان پل کا کام دیں۔ ایسی مصالحتی خدمات منظم بنیاد پر بہت سی ایسی صورتوں میں قائم ہوسکتی ہیں جن میں تشدد کا خطرہ دامن گیر ہو۔

جب اجلاس کا خاتمہ قریب آیا تو دوسرے ارکان قومی یا بین الاقوامی کھنچاؤ اور تشدد میں کمی کے بارے میں اپنی تجاویز لائے۔ مثلاً نوجوانوں کے لیے "امن کور" جیسی سرگرمیاں، درسی کتابوں پر نظرِثانی تاکہ وہ تشدد کی تلقین نہ کرسکیں۔ اسکولوں میں بین الاقوامی مفاہمت پر تعلیم اور یونیسکو کی طرف سے دنیا کے تعلیمی نظاموں کا ایک سروے تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ یہ لوگوں کو ایسی سوچ کیوں دیتے ہیں کہ وہ ایک برتر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اجلاس میں یونیسکو کے جو پرانے کارکن موجود تھے وہ قریب قریب یہ سوچ رہے تھے کہ ان کا کسی آسیب سے سامنا ہو رہا ہے۔ قریب قریب پچیس سال پہلے جب یونیسکو کا ادارہ وجود میں آیا تو یہی تصورات سامنے تھے۔ دنیا جنگ سے برباد ہو کر اتنی چور ہو چکی تھی کہ لوگوں کو یقین تھا کہ آئندہ ایسی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ آج وہ سراب ختم ہو چکا ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ جس چیز کا پہلے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا، اب پھر نظر کے سامنے بھی ہے اور دماغ میں بھی۔ اس اجلاس سے ظاہر ہوا کہ انسانی بقا ممکن ہے۔ بشرطے کہ انسان یہ پہچان لے کہ وہ جس راستے پر چلتا ہے اس کا سبب کیا ہے، لیکن اگر اس نے یہ نہ پہچانا تو اس کے لیے بقا کے زیادہ مواقع باقی نہیں رہیں گے۔

باب اوّل - ب

سیلی کیوی گھاد

جنگ ہماری سرشت میں نہیں ہے

ایسی عورتیں اور مرد اب بھی زندہ ہیں جنھیں یاد ہوگا کہ اس وقت کتنی بار کراہیت کا اظہار کیا گیا تھا جب ڈاروں کا یہ نظریہ منظرِ عام پر آیا کہ ہم "بندر کی اولاد" ہیں۔ دراصل نفرت ہوئی تو "اولاد" کے لفظ سے کیوں کہ یہ لفظ عام طور پر ایک زیادہ ذاتی انداز میں استعمال ہوتا رہا تھا۔ مثلاً "میں اسکاٹش آبا و اجداد کی اولاد ہوں"۔ مطلب یہ کہ میں اُن میں سے ہوں، میں انھی کی طرح ہوں۔ ظاہر ہے ڈاروِن کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے بندروں سے ارتقا کیا ہے اور بندروں سے مُراد تھی وہ تمام جانور جو ارتقا پذیر ہوئے۔

ارتقا کو ابتدا میں بے دلی سے قبول کیا گیا تو جسمانی ڈھانچوں کے سلسلے میں۔ ایسے ثبوت سے انکار کرنا مشکل تھا کہ ایک سادہ تر دماغ کے اُوپر آہستہ آہستہ ایک سوچنے والے بھیجے کی تہ بن گئی۔ بہرحال طرزِ عمل کے ارتقا کا تصوّر مدّھم رفتار سے حمایت حاصل کر سکا، کیوں کہ متحجّر اجسام کا کوئی طرزِ عمل نہیں ہوتا۔ زمین میں مدفون ہڈیوں کی دریافت پر یہ اندازے تو لگائے جا سکتے ہیں کہ یہ ہڈیاں کس طرح استعمال ہوتی تھیں، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کبھی یقین کے ساتھ آج کے جانوروں کی یا خود ہماری عادات کی اصل جان سکے؟

اس کے باوجود طرزِ عمل کا ارتقا اب حیاتیات کے دائرے میں گرما گرم بحث کا موضوع بن رہا ہے۔

اس کی بنیاد خود ڈاروِن نے اس وقت ڈالی، جب اُس نے "انسان اور جانوروں میں جذبات کا اظہار" کے نام سے ایک کتاب لکھی، اور بتایا کہ جذبات کے آثار کس طرح ایک دوسرے سے گہرے انداز میں ملتے جلتے ہیں۔ اس کتاب کو کم از کم نتائج کے اعتبار سے بڑی حد تک نظرانداز کر دیا گیا، کیونکہ میکانکی دور آ چکا تھا، اور اب اس بات میں زیادہ دلچسپی لی جاتی تھی کہ اسیر جانوروں کو آلات میں رکھا جائے، اُن کے اضطراری افعال کی آزمائش کی جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ وہ بھول بھلیوں میں راستہ تلاش کرنے کی کتنی قابلیت رکھتے ہیں۔ آیا وہ رنگوں اور اشکال کو پہچان سکتے ہیں اور ان میں فرق جان سکتے ہیں ــــ اور اسی طرح کے دوسرے مسائل۔

بہرحال ۱۹۵۰ء کے قریب ایک ایسا گروہ تجربہ گاہوں سے نکل آیا جو اپنے آپ کو تشکیلِ سیرت کے علم کا ماہر قرار دیتا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ جانوروں کے طرزِ عمل کے بارے میں زیادہ سے زیادہ قابلِ اعتماد حقائق اسی طرح حاصل

ہو سکتے ہیں کہ جانوروں کا مشاہدہ اُن کے قدرتی مسکنوں میں کیا جائے ۔ ان لکری مہنروں نے جو دسیا لیتیں کیں اُن سے بہت جلد یہ واضح ہو گیا کہ ہم واقعی اس بارے میں زیادہ نہیں جانتے کہ بیشتر جانور کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں ۔ کیمبرج یونی ورسٹی کے ڈاکٹر ولیم ایچ ۔ تھارپ اُن لوگوں کی صف میں شامل تھے جو بڑی جرأت کے ساتھ اس بیان کے ساتھ میدان میں آئے کہ " جانوروں کے طرزِ عمل کا مشکل ہی سے کوئی ایسا پہلو موجود ہو جس کا کوئی تعلق انسانی طرزِ عمل کے مسائل سے نہ ہو ۔"

تشکیلِ سیرت کے علم کے بعض ماہرین مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور تجربہ گاہوں کی جانب لوٹ گئے ۔ جو میدان میں رہ گئے انھیں کچھ تمسخر برداشت کرنا پڑا ۔ انھیں بوائے سکاؤٹ کہا گیا ۔ اُن پر طعن آمیز نکتہ چینی کی گئی کہ اُن کا کام سائنس کی حیثیت نہیں رکھتا ، کیوں کہ کا معتدبہ حصہ تجربات کے بغیر ہوتا ہے ۔ ان میں سے بعض باتوں پر قدرتی طور پر اعتراض پیدا ہوا ، کیوں کہ اب شاذ ہی اس علم کے ماہرین وحشی جانوروں کی محض روزمرہ زندگی کے بارے میں ہمارے علم کے عظیم خلا کو پُر کر رہے ہیں ۔ اب فیلڈ میں جو کام ہو رہا ہے اُس میں تجربات ایک ناگزیر امر ہیں اور بعض ماہرین تو جانوروں کا مطالعہ انھیں مصنوعی ماحول میں رکھ کر بھی کرتے ہیں ۔ وہ اس ماحول کو نیم جنگلی یا نیم وحشی ماحول کا نام دیتے ہیں ۔

اسی اثنا میں جانوروں کے طرزِ عمل نے غیر سائنسی لوگوں کا دل موہ لیا ہے ۔ اب قارئین جائے ایڈمسن کی ایلسا کتابیں اور جارج شالر کی اپنے گوریلا ساتھیوں کی رودادیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں ۔ وہ جین وان لاوک گڈال کی اُن تحریروں کو بھی شوق سے پڑھتے ہیں جن میں وہ اُن لنگوروں کا تذکرہ کرتی ہے جن کے ساتھ وہ خود بھی رہتی ہے اور اُس کا شوہر بھی ۔ جانوروں میں دلچسپی کی اس پیاس کو عام پسند فلموں اور ٹیلے وژن پروگراموں سے بھی بجھایا جاتا ہے ، اور اگر کثرت ماہرین حیاتیات انسانی طرزِ عمل میں ورثے کے کچھ خطوط کو تسلیم کرنے سے منکر ہیں تو کم از کم عوام الناس تو ہر طرف سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ ہم زندہ جانوروں سے کیا سیکھ سکتے ہیں ۔

نر اور مادہ کے درمیان رشتے کی نوعیت کیا ہے ؟ جانور بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت کیسے کرتے ہیں ؟ اُن کی صحت کی کیفیت کیا ہوتی ہے ، اور اسے کس طرح برقرار رکھتے ہیں ، کھانے پینے کی عادات کیا ہیں ، کس طرح آرام کرتے ہیں اور کھیلنے کے انداز کیا ہیں ؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں ہماری زندگی میں جنگ جیسے بڑے خطرے سے سابقہ رہتا ہے ، وہاں جانوروں کی جارحیت کا کیا انداز ہے ؟

موخر الذکر دو تازہ اور قابلِ مطالعہ کتابوں کا موضوع رہا ہے ۔ ایک "جارحیت پر" جسے کانراڈ لورینز نے لکھا ، جو لوسٹریا کے جانے پہچانے ماہرِ حیوانیات ہیں ۔ دوسری " علاقائی تقاضا " جسے رابرٹ آرڈرے نے لکھا ۔ موصوف امریکی انشا پرداز اور پیشے کے اعتبار سے ماہرِ بشریات ہیں ۔ دونوں مصنفین بتاتے ہیں کہ لڑائی ایک جبلّی

فوٹو جرزی حر ریلے ٹیز، پیرس

لاطینی محاورہ — انسان انسان کے لیے بھیڑیا ہے — کو قریب قریب ہر اس معاشرے نے اختیار کر لیا ہے، جو اپنے رواج، قوانین یا زبان قدیم روم سے حاصل کرتا ہے۔ یہ محاورہ بھیڑیے کے لیے گالی کی حیثیت رکھتا ہے، کیوں بھیڑیے کا طرزِ عمل دوسرے بھیڑیوں کے ساتھ شریفانہ ہوتا ہے۔ زیادہ مناسب محاورہ یہ ہوگا کہ — انسان انسان کے لیے چوہا ہے، کیوں کہ جس طرح انسان انسان کو ہلاک کرتا ہے، اسی طرح استثنا کے طور پر گوشت خوروں میں بعض چوہے دوسرے چوہوں کو کھا لیتے ہیں۔

چیز ہے، جو قریب قریب تمام اعلا پائے کے جانوروں میں اظہار چاہتی ہے — اور ہم میں بھی، کیوں کہ ہم نے مصنفین کے دعوے کے مطابق اس تقاضے کو ورثے میں پایا ہے۔ بہر حال اس سے پہلے کہ اُن کے دلائل کی جانچ پڑتال کی جائے، مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جارحیت کے مطلب کی ٹھیک ٹھیک تعریف کر لی جائے۔

زیادہ تر عام لوگوں کا دھیان فوراً اُن حملوں کی طرف جائے گا، جو جانور غذا کے لیے شکار کی صورت میں کرتے ہیں۔

شکار کا تعاقب کرتے ہیں، اس پر جھپٹتے ہیں اور اُسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ بہر حال جسمانی تشریح اس قسم کے قتل کو مستثنیٰ کرتی ہے، کیوں کہ اس میں کوئی بغض کارفرما نہیں ہوتا۔ جب ایک بھیڑیا کسی بیمار یا معمر ہرن (مضبوط ہرن بھیڑیے سے زیادہ تیز بھاگتا ہے) کا شکار کرتا ہے تو اُس میں غصّے کا عنصر نہیں ہوتا۔ ویسے ہی جیسے ہم قصاب کی دکان سے گوشت خریدتے وقت غصّے میں نہیں ہوتے۔ وہ محض بھوکا ہوتا ہے۔

اسی طرح اُن مختلف المتنوّع جانوروں میں بھی کوئی حقیقی جارحیت، کوئی بغض نہیں ہوتا جو جنگل میں اپنے اپنے طریقے کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ظاہر وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر نوع کے جانوروں کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اور شاید اپنے بے زبان انداز میں وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دوسری انواع کے جانوروں کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ جس راستے پر سب چلتے ہیں یا جس چشمے سے سب پیاس بجھاتے ہیں وہاں کم زور اور چھوٹے جانور اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں اور زیادہ طاقت ور جانوروں کو بغیر کسی جھگڑے کے آنے جانے دیتے ہیں۔

اگر صحیح حیاتیاتی معنوں میں لیا جائے یا جن معانی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے لورینز اور آرڈرے نے لفظ استعمال کیا ہے، جارحیت کا ارتکاب اُس وقت ہوتا ہے جب ایک ہی قسم کے دونوں جانور ایک ہی چیز کے حصول کے لیے لڑتے ہیں۔ جانوروں کی اکثریت کے لیے یہ "ایک ہی چیز" رہنے کی جگہ ہوتی ہے، جہاں انھیں سال بھر بچے پالنے ہوتے ہیں گویا یہ جھگڑا ہوتا ہے گھر کے لیے یا دوسرے الفاظ میں علاقے کے لیے۔

بعض اوقات کسی مطلوبہ مادہ کی ملکیت کے لیے یا خاندان میں حیثیت کے لیے جارحیت ابھرتی ہے۔ ماہرینِ حیاتیات اکثر متنازعہ مادہ کے ارد گرد کی جگہ کو علاقے کا نام دیتے ہیں۔ جب وہ حرکت کرتی ہے تو یہ جگہ بھی حرکت میں آتی ہے اور ساتھ چلتا ہوا نر کسی دوسرے نر کو ایک مخصوص اور سوچے سمجھے فاصلے کے اندر داخل نہیں ہونے دے گا۔

لورینز اور آرڈرے دونوں نوعِ انسانی میں جارحیت کی تعریف کا رشتہ گھر کی زمین سے جوڑتے ہیں۔ وہ اُن جائدادوں کی طرف توجّہ دلاتے ہیں، جن پر بورڈ لگا ہوتا ہے "یہ شارعِ عام نہیں ہے" اور یہی اُن کا اصل موضوع رہا ہے۔ وہ فارموں اور نواحی بستیوں کے تصوّر کو قوم تک توسیع دیتے ہیں، اور یہ دعوا کرتے ہیں کہ انسان تقریباً اُسی طرح غیر ارادی طور پر اپنی قومی سرحدات کی حفاظت یا توسیع کے لیے لڑتے ہیں، جس طرح اپنے گھروں کے لیے وہ دوسری قوموں کے سپاہیوں سے لڑتے ہیں، کیوں کہ اُن کے بہت قدیم جانور آباو اجداد کسی زمانے میں جبلّی طور پر اپنے آشیانے، اپنے بھَٹ، شکار کے علاقے یا مادہ کے ارد گرد کی جگہ کے لیے لڑتے تھے۔

لورینز اور آرڈرے دونوں کی جچی تلی رائے یہی ہے۔ جنگ ایک جبلّی مجبوری ہے لورینز کہتا ہے کہ

اوپر: ایک امریکی مصوّر فلپ کرک لینڈ ہمارے جارحیت پسند معاشرے کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ فوٹو ح سائیکولوجی ٹوڈے میگزین کمیونکیشنز' ریسرچ ' مشینز' اِنک

جانوروں کی جارحیت کا اہم ترین فریضہ یہ ہے کہ جتنی زمین سکونت کے لیے دست یاب ہے، اُس میں سے ایک قسم کے جانوروں کو اپنی اپنی جگہ دے دی جائے۔ دوسرے الفاظ میں اُن میں "علاقوں" کی تقسیم عمل میں لائی جائے۔ وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ "اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا اور یہی رائے کسی بھی حیاتیاتی ذہن کے حامل سائنس داں کی ہوتی کہ انسان میں داخلی مخصوص جارحیت اتنی ہی بے ساختہ جبلّی سعی کی حیثیت رکھتی ہے جتنی بیشتر بڑے فقری جانوروں میں ہوتی ہے۔"

دوسری طرف آرڈرے کہتا ہے، "اگر ہم زمین کی ملکیت کا دفاع کرتے ہیں یا اپنے ملک کی خود مختاری کی حفاظت کرتے ہیں، تو ایسی وجوہ کی بنا پر جو ادنا جانوروں کے کردار کے اسباب سے نہ مختلف ہیں، نہ کم فطری ہیں اور نہ کم ناقابلِ استعمال ہیں۔" آرڈرے نے یہ بھی کہا کہ "ہم سب اپنا سب کچھ ایک ایسی جگہ کے لیے دے دیں گے جسے ہم اپنی جگہ کہہ سکیں۔" اور یہ بھی لکھا کہ "مجھے یقین ہے کہ انسان کے ان گنت علاقائی اظہارات ایک ایسے لازمی امر کا انسانی ردِّ عمل ہیں، جو مساوی قوّت کے ساتھ قوتوں اور انسانوں دونوں پر منطبق ہوتا ہے۔"

عام عقیدہ یہ ہے کہ انسانی جنگیں ایک جبلّی امر ہیں اس سے ماہرینِ حیاتیات ناگزیر کا مطلب لیتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسا مطلب لینے سے ناگزیر قرار دینے کا رجحان ہی راجح ہوگا۔ اس لیے یہ معلوم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیا جانوروں میں جارحیت ہمہ گیر ہے اور یہ ضرورت کتنی شدید ہے۔ مصنّفین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جارحیت نوعِ انسانی کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اگر یہی بات ہے تو جنگ آزمائی ہماری تقدیر میں لکھی ہوئی ہے اور امن کے لیے اُمید بہت کم نظر آئے گی۔

اس بات سے سب کو اتفاق ہونا چاہیے کہ کم از کم جنسی ملاپ کے موسموں میں علاقائی سرحدی خطوط پر جھگڑے رہتے ہیں۔ موسمِ بہار میں، جب جانوروں کے بیشتر بچّے پیدا ہو جاتے ہیں یا مادہ حاملہ ہوتی ہیں، ایسے علاقوں یا رقبوں کے لیے بہت کش مکش ہوتی ہے۔ جہاں بچّوں کی پرورش ہو سکے اور اُن کے لیے خوراک مہیا ہو سکے، لیکن جانوروں کی بعض اقسام کے لیے موسمِ گرما کا آخری حصہ یا خزاں کا ابتدائی حصّہ مستی کا موسم ہوتا ہے اور اسی زمانے میں مادہ کے اردگرد کے علاقے کے لیے یہ لڑائی ہوتی ہے۔ زیادہ تر صورتوں میں ایسے جارحانہ طرزِ عمل کا تعلق تولیدی ضروریات سے ہوتا ہے۔

خود جانوروں کے لیے علاقے کا مطلب غالباً اسی طرح سے گھر ہوتا ہے جس طرح ہمارے لیے گھر عام مکان سے کچھ زیادہ معنی رکھتا ہے۔ ممکن ہے اُن کی ضرورت عارضی ہو، لیکن اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کہ وہ جبلّی طور پر اس کے لیے لڑتے ہیں۔

لیکن کتنے ہمہ گیرانداز میں اور کتنی بے جگری سے ؟ اگر کچھ جانور بلکہ ان میں سے کوئی ایک بھی اس مجبوری سے فرار کرسکتا تو آبادی جنگ کی بربادی ہمیں اتنی ناگزیر نظر نہ آتی ۔

ہرنوں کا کوئی علاقہ نہیں ہوتا اور نہ ہاتھیوں کا۔ سمندری اُود بلاد کی بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ پانی کے اندر جنسی ملاپ کرتے ہیں اور بچوں کو سمندری جھاڑیوں کے جھنڈوں میں پلتے ہیں۔ خیال ہے کہ وھیل مچھلیاں بھی امکانی طور پر الگ الگ گھر کی جگہ نہیں بناتیں، اگرچہ اس بارے میں کوئی شخص بھی صحیح معلومات نہیں رکھتا۔ قطب شمالی کے جانور "لیمنگ" ایسی بستیوں میں رہتے ہیں جو بحر منجمد شمالی کے برفانی ٹیلوں کے خالی غاروں میں آباد ہوتی ہیں۔ ہر آشیانے میں کئی لیمنگ اکٹھے سوتے ہیں۔ بہر حال جب کوئی حاملہ بچہ پیدا کرنے والی ہوتی ہے تو وہ اپنا الگ آشیانہ بنالیتی ہے۔

ان بستیوں کو نوآبادیاں کہا جاسکتا ہے۔ خطۂ معتدل میں بہت سی قسم کے جانور مشترکہ مسکن بناتے ہیں، مثلاً گورخر، خرموش گیاہی اور ایک خاص قسم کی گلہری۔ زیادہ تر اقسام کے بارے میں ایسی معلومات نامکمل ہیں کہ سال کے دوران میں مختلف مراحل میں اُن کی چھپی ہوئی دنیاؤں میں کیا ہوتا ہے۔ بعض نوآبادیاں مشترکہ کوشش سے اپنے علاقے کی حفاظت کرتی ہیں اور بعض حفاظت نہیں بھی کرتیں۔ یہ رواج تو عام ہے کہ بھٹ کے اندر خاندان اپنے یونٹ کی حفاظت کرتا ہے۔

امریکی مینا یا سار (کاؤ برڈز) بھی تو ہیں جو دوسرے جانوروں کے آشیانوں میں انڈے دیتے ہیں اور خود وہ مویشیوں کی پیٹھ پر رہتے ہیں اور اُن کی کھال میں چھپے ہوئے کیڑوں کو کھاکر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ سوچنا دل چسپی سے خالی نہیں کہ آیا انفرادی کاؤ برڈ مویشیوں کو اپنا علاقہ تو نہیں سمجھے۔ بظاہر اس کا کوئی امکان نہیں۔

جہاں تک اعلا حیوانات کا تعلق ہے، بیشتر بندر گروہوں کی صورت میں رہتے ہیں۔ بعض میں خاندانی معاشری تنظیم بھی موجود ہوتی ہے۔ جب کوئی مادہ ہیجان میں ہوتی ہے اور نر بندروں میں مناقشے کی صورت پیدا ہوتی ہے تو عام طور پر سب سے غالب نر کو پہلا موقعہ ملتا ہے۔ دوسرے گروہوں میں جنسی اختلاط آزادانہ ہوتا ہے اور اُن میں لڑائی اکثر ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہے۔ اگر بچے زیادہ لڑاکا ہوں، تو بالغ نر اُنھیں ایک دوسرے سے الگ کردیتے ہیں۔

چلّانے والے بندر اپنے گروہی رقبوں کی ملکیت کا دعوا کرتے ہیں، لیکن حفاظت کرتے ہیں تو عام طور پر محض زبانی احتجاج کی صورت میں گبن نامی بندروں کا بھی یہی حال ہے۔ جب وہ چیخ پکار سے دخل دینے والوں کو نکالنے میں ناکام رہتے ہیں تو کاٹ بھی لیتے ہیں، لیکن ایسے مواقع شاذ و نادر ہی آتے ہیں۔

علم تشکیل سیرت کے برطانوی ماہر جے۔ایچ۔کروک نے ۶ اپریل ۱۹۶۷ء کے "دی لینسر" میں علاقے

کے مسئلے پر بحث کی تھی۔ جن پرندوں اور جانوروں کے بارے میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے علاقے کی حفاظت کرتے ہیں، موصوف نے اُن کے بہت لچک دار طرزِ عمل کی تشریح کی۔ انھوں نے لکھا "ایک علاقہ فرد کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے گہری مناسبت پیدا کرلے۔ اس سے تلاشِ خوراک کی کارکردگی اور دشمنوں سے پناہ ڈھونڈنے کی رفتار میں اضافہ ہوجاتا ہے۔" لیکن بعض مُرغابیاں جو اپنے سرمائی مقام پر یا نقل مکانی کے وقت جنسی اختلاط کرتی ہیں، وہ اس نئے ساتھی کے ساتھ اُس کے گھر جاتی ہیں، اپنے گھر کو نہیں لوٹتیں۔"

بعض جانور مقامی حالات کے ردِ عمل کے طور پر علاقے بدل لیتے ہیں۔ خشک سالوں میں دلدلی سکونت والے بیا نامی پرندے اپنے آشیانے ایک وسیع زمینی رقبے پر پھیلا دیتے ہیں۔ جب بارش کے سال آتے ہیں تو وہ سیلابی پانی کے کسی تالاب میں کھڑے بڑے سے درخت پر اپنے آشیانے مرتکز کرلیتے ہیں۔ جیلاڈا قسم کے بن مانسوں کے خاندانی گروہ ایسے سالوں میں آزادی سے آوارہ پھرتے ہیں، جب غذا کی قلت ہوتی ہے، لیکن "جب غذا افراط سے ملے تو پھر بڑے بڑے گروہوں کی صورت میں جمع ہوجاتے ہیں۔ اُن کے کوئی علاقے نہیں ہوتے اور مسکن کا دارومدار مقامی طور پر غذا کی فراہمی پر ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر کروک بتاتے ہیں کہ چمپانزی لنگور اپنی پارٹیوں کی نفری گھٹاتے بڑھاتے رہتے ہیں۔ عام دستور یہ ہے کہ افراد یا چھوٹے گروہ بہت وسیع علاقوں میں پھرتے رہتے ہیں، اور "علاقائی کردار بہ ظاہر غیر موجود ہے۔" وہ کہتے ہیں کہ حقائق پیچیدہ ہیں، منتشر ہوجانے کے انداز کا بھی انحصار بڑی حد تک سیکھنے اور روایت پر ہے، اور یہ اُس وقت زیادہ صحیح ہوتا ہے جب ہم بندروں جیسے ترقی یافتہ دودھ پلانے والے جانوروں کا ذکر کرتے ہیں۔ علاقے کے انتخاب کا زیادہ تر دارومدار کسی ایسی خصوصیت پر نہیں ہوتا جو براہِ راست پیدائش سے چلی آتی ہے بلکہ اُن اشیا پر ہوتا ہے جن کے لیے دودھ پلانے والے اعلا جانور مقابلہ کرتے ہیں۔ پس مختلف اقسام کے ماحول میں علاقائی نظام بھی مختلف ہوں گے اور ہوسکتا ہے کہ بعض صورتوں میں یہ بالکل ناموجود ہوں۔

آرڈرے ماہرِ حیاتیات نہیں ہے اور وہ یہ حقیقت واشگاف انداز میں اور قابلِ تعریف طریقے سے اپنی کتاب میں بتاتا ہے۔ پیشہ وروں کے کام کی رُوداد پیش کرتے ہوئے اُس نے اُس زور کا بظاہر محض غلط اندازہ کیا ہے جو اُنھوں نے علاقوں اور علاقائی جارحیت پر دیا ہے۔

بے شک لورینز علمِ تشکیلِ سیرت کے ماہر کی حیثیت سے عالمی شہرت کا مالک ہے، لیکن جانوروں کے ساتھ اُس کا تجربہ ایک مختلف انداز میں محدود رہا ہے۔ اُس نے زیادہ تر تحقیق سدھائے ہوئے جانوروں کے ساتھ کی ہے۔ مثلاً بطخیں جو حفاظتی باڑھ اور خوراک سے مجبور ہو کر ایک انسانی ماحول میں رہتی ہیں یا وہ اسیر

مچھلیاں، جو تالابوں میں پرورش پاتی ہیں جو جانور اس طرح پابند کر دیے جاتے ہیں، اُن کی جارحیت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا۔

جیسا کہ لورینز خود وضاحت کرتا ہے، جانوروں کی دو قسمیں مچھلیاں اور پرندے اُن جانوروں میں شامل ہیں جو "انفرادی فاصلہ" چاہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ کسی جگہ بھی اور کسی وقت بھی اپنے ہم جنسوں کا قرب پسند نہیں کرتے۔ لورینز کی مچھلیوں اور بطخوں نے ساتھیوں سے گہری وابستگی کی مجبوری سے تنگ آ کر ایسے مفصّل طریقے وضع کر لیے جن سے اپنے نسلی ساتھیوں کو چھوڑ کر پڑوس کے نر جانوروں پر جارحیت کا رُخ پھیر دیا۔ چوں کہ یہ محض علامتی حملے ہوتے ہیں، اس لیے قریب کا نر شاذ ہی زخمی ہوتا ہے۔ اس طرح اصل جانور اپنی جارحیت کی آسودگی پر فاتحانہ انداز میں اپنے ساتھی کی طرف لوٹ آتا ہے۔

ہماری قسم کے جانور یعنی دودھ پلانے والے جانور اسی قسم کے طریقے اختیار نہیں کرتے، کیوں کہ دودھ پلانے والے جانور "رابطہ پسند" ہوتے ہیں۔ وہ اپنی قسم کے جانوروں کا قرب چاہتے ہیں اور اُن سے مس کر کے لطف لیتے ہیں۔ لورینز نے ایسے جانوروں کے درمیان فرق کو مختصر انداز میں بیان کیا ہے جو اپنے جنسوں کا قرب پسند کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان دونوں کے درمیان فرق بہت زیادہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

لورینز نے یہ مشاہدہ تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا ہے کہ جتنے بھی جانور شدت سے جارحیت پسند ہیں، اُن میں اپنے ہم جنس جانوروں کو ہلاک کرنے کی زبردست ممانعت کا رواج ہے۔ اُن میں ایک دوسرے کو ناراض کرنے کی ریت تو ہے، لیکن طرزِ عمل کی بعض ایسی روایات قائم ہو چکی ہیں جو انھیں مہلک نتائج کی حامل لڑائی سے روکتی ہیں۔

لورینز ایک شکست خوردہ بھیڑیے کا جانا پہچانا ردِّ عمل بیان کرتا ہے۔ جس وقت وہ جان لیتا ہے کہ لڑائی ہار دے گا وہ منھ موڑ لیتا ہے۔ فاتح اس حرکت کو سمجھ لیتا ہے اور قبول کر لیتا ہے۔ جب ۱۹۵۲ء میں "کنگ سالومنز رنگ" نامی کتاب میں لورینز نے بھیڑیے کا طرزِ عمل بیان کیا تو کہا کہ ہارنے والا اپنے مخالف کی خدمت میں "اپنی گردن" پیش کرتا ہے۔ یہ بھیڑیوں کے درمیان ایفائے عہد کا ایک موثر ثبوت ہے کہ فاتح ہمیشہ آخری حملے سے گریز کرتا ہے۔

اُس وقت سے لورینز زیادہ پختگی کے ساتھ ایک ماہر بن گیا ہے۔ اپنی کتاب "جارحیت کے موضوع پر" میں لورینز نے ہارنے والے کے طرزِ عمل کو عجز و انکساری اور نرم روی کی اُن حرکات میں شمار کیا ہے، جن کا آغاز کم عمری میں ہوا اور بلوغت میں بھی باقی رہیں۔ یہ کسی ایسے شخص کے لیے تعجب کا باعث نہیں جو جانتا ہے کہ ایک نارمل کتا کتے کے بچوں پر حملہ کرنے سے کس شدت سے گریز کرتا ہے۔ بہر حال کسی طرح بھی بیان کیا جائے

بھیڑیے کے اداب کام آتے ہیں اور ان سے ہم جنسوں کی ہلاکت رُکتی ہے۔

آداب کے مطابق بے ضرر لڑائی کی ایک اور صورت "ٹورنامنٹ" ہے، مثلاً مستی کے زمانے میں دو ہرنوں یا دوسرے سُم دار چوپایوں میں ایک دوسرے کو دھکیلنے کا مقابلہ۔ اگر وہ واقعی ایک دوسرے کی ہلاکت کے متمنّی ہوتے تو شکار کرنے والے جانوروں کی طرح اپنے سُموں سے حملہ کرتے، لیکن اس کی جگہ وہ ایک دوسرے کے سینگوں میں سینگ الجھا دیتے ہیں اور ایک دوسرے کو اس طرح پسپائی پر مجبور کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ جب ان میں سے کوئی جانتا ہے کہ وہ ہار رہا ہے تو وہ اپنے سینگ چھڑاتا ہے اور بھاگ جاتا ہے، اور جیتنے والا اپنی مادہ کے پاس چلا جاتا ہے۔

غالباً اپنے موضوع پر زیادہ توجّہ دینے کی وجہ سے آرڈرے اور لورینز دونوں نے ہم جنسوں کی جارحیت کے بارے میں مبالغہ آمیز تاثرات لیے ہیں۔

جب لورینز "اس ساری لڑائی" کا ذکر کرتا ہے اور اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ لڑائی فطرت میں "ہمیشہ سے ایک عمل" رہی ہے، تو وہ ایک ایسے جنگل کی زندگی پیش کرتا ہے، جسے میری طرح کے وہ لوگ کبھی نہیں مانیں گے۔

میں نے جنگلوں میں سال ہا سال مسلسل زندگی گزاری ہے۔ بعض اوقات صبح کے وقت برف پر اس جگہ خون نظر آتا ہے جہاں لومڑی اور خرگوش کے نقوشِ پا ایک دوسرے میں خلط ملط ہو جاتے ہیں، لیکن خون شکار کی شہادت دیتا ہے، اس بات کی نہیں کہ ایک جانور کی اپنی ہی قسم کے جانور کے ساتھ مڈبھیڑ ہوگئی۔

اصل جارحیت اپنے آغاز اور مقصد میں عام طور پر نتیجہ خیز ہوتی ہے، لیکن اس کا جانوروں کے ساتھ اتنا مختصر تعلق ہوتا ہے کہ جن درجنوں اقسام کے جانوروں سے میں واقف ہوں وہ اپنے نصف وقت سے کہیں زیادہ اور بعض سال میں گیارہ مہینے، اپنے ساتھیوں کی وقتی یا دل کش صحبت میں رہتے ہیں۔

سیاہ ریچھ اس کی نمایاں مثال ہیں۔ ایک سطحی، لیکن کامیاب معاشقے کے بعد نر سُست رفتار زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے اور دن کا بیشتر حصّہ جھاڑیوں میں اپنے چار پانچ نر ساتھیوں میں گزار دیتا ہے۔ بہر حال دشمنی کا مظاہرہ ہوتا ہے، لیکن صرف اُن ریچھوں سے، جن کا رنگ مختلف ہو۔ جنگلات میں کام کرنے والے بتاتے ہیں کہ یہ مستردشدہ ریچھ اعصابی مریض بن جاتے ہیں۔

لورینز اور آرڈرے، دونوں جارحانہ اور مدافعتی لڑائی میں فرق محسوس کرتے ہیں۔ کیا وہ جانور جارحیت پسند ہے جو اپنے علاقے کی حفاظت کرتا ہے؟ اگر نہیں اور اگر صرف حملہ آور ہی کو جارحیت پسند قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر کتنے ہیں، جو اس طرح مداخلت کرتے ہیں؟ بہت کم، سوائے اُن کے جو اسیر ہوں۔ بھیڑیوں میں سے اگر کوئی

ایک کسی دوسرے کے کنبے کے علاقے میں آتا ہے، تو ممکن ہے، اُس کا مقصد محض رفاقت کی تلاش ہو (ایک تنہا بھیڑیا عام طور پر یتیم ہوتا ہے)۔ زیادہ تر مبصرین کے مطابق اُس پر حملہ نہیں کیا جاتا ہے، اُس کو صرف دھمکایا جاتا ہے اور وہ چلا جاتا ہے اور اُس کا علاقے کی سرحد تک تعاقب نہیں کیا جاتا۔

جو لوگ جنگل کا اندازہ ڈارون کے گھریلو باغ سے یا لورینز کے باڑ دار احاطے اور لیبورٹری یا آرڈرے کی لائبریری سے کرتے ہیں، اُن میں یہ رجحان ہوتا ہے کہ چوہوں، بھیڑیوں اور شیروں جیسے ڈرامائی جانوروں پر زیادہ زور دیں۔

چوہے رابطہ پسند جانور ہیں اور لورینز نے چوہوں میں جو چند لڑائیاں دیکھیں ان کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ وہ ذاتی محاذ آرائیاں نہیں تھیں اور یہ کہ چوہوں کے قبیلے تمام بیرونی چوہوں کو ہلاک کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ ایسی گروہی جارحیت خاص طور پر بدشگونی کی مظہر نظر آتی ہے، کیوں کہ یہ نوعِ انسانی کی قومی جنگوں سے امکانی مشابہت رکھتی ہے، لیکن یہاں بطخوں اور مچھلیوں کی طرح لورینز اسیروں کی مہیا کردہ شہادت پیش کر رہا ہے اور اسیر بھی ایسے، جنھیں ایسے غیر تسلی بخش حالات میں رکھا جاتا ہے کہ اس سے لڑنے کی انگیخت ہوتی ہے۔

جیسا کہ لورینز بیان کرتا ہے، "اسٹائی نگر" نے مختلف مقامات سے لائے ہوئے بھورے چوہوں کو ایک ایسے بڑے احاطے میں چھوڑ دیا جہاں انھیں رہن سہن کے مکمّل قدرتی حالات حاصل تھے۔ پہلے چوہے ایک دوسرے سے خائف معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے مزاج میں جارحیت نہیں تھی، لیکن اگر اتفاقاً اُن کی مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ ایک دوسرے کو کاٹ لیتے۔ بالخصوص جب دونوں احاطے کی ایک جانب ایک دوسرے کی طرف آتے آتے تیز رفتاری کے عالم میں ٹکرا جاتے تھے۔ (بر سبیل تذکرہ، زیادہ تر ماہرینِ حیاتیات کسی احاطے کے اندر کے حالات کو مکمّل طور پر قدرتی نہیں قرار دیں گے، بالخصوص ایک چھوٹے سے احاطے میں جہاں باڑ کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے جانور ٹکرا جائیں)۔

اسٹائی نگر کے چوہے جلد ہی ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے لگے، اور لڑتے چلے گئے تا آنکہ ایک جوڑے کے سوا باقی سب ہلاک ہو گئے۔ اس جوڑے کی اولاد ایک قبیلہ بن گئی اور اس کے بعد جو اجنبی چوہا احاطے میں داخل کیا گیا اُسے ہلاک کر دیا گیا۔

جن سالوں میں یہ مطالعہ ہو رہا تھا، بالٹی مور میں جان۔ بی۔ کیل ہون بھی چوہوں کے طرزِ عمل پر تحقیق کر رہا تھا۔ اسٹائی نگر کی اصل آبادی میں پندرہ چوہے موجود تھے اور کیل ہون کی آبادی میں چودہ۔ وہ بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے، لیکن کیل ہون کا احاطہ اسٹائی نگر کے احاطے سے سولہ گنا بڑا تھا۔ دوسرے معاملات میں زیادہ سازگار ماحول کا حامل تھا۔ ایسے چوہوں کے لیے پناہ گاہیں موجود تھیں جن کا مخالف چوہے تعاقب کرتے تھے (غالباً ایسی پناہ گاہیں جنگل میں

اوپر، نوجوان نسل مستقبل کے غیر جارحانہ معاشرے کو کس طرح دیکھتی ہے۔
فوٹو:۔ راجر میلک c میگنم فوٹوز، پیرس

بھی ہوتی ہوں گی) اور کیل ہون کے تمام چوہوں پہ امتیازی نشان موجود تھے۔
اس بڑے رقبے میں ایک مینار تھا جہاں سے ستائیس مہینے تک تمام چوہوں کی حرکات
رکارڈ کی گئیں۔ایک دوسرے سے معمولی واقفیت کے دوران میں چند لڑائیوں کے بعد چوہے دو
قبیلوں میں بٹ گئے اور دونوں میں سے کسی نے دوسرے کو نابود کرنے کی کوشش نہ کی۔
کچھ چوہے ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے کے علاقوں میں جاتے اور لوٹ آتے اور انہیں روکا نہیں

گیا بلکہ بعض اوقات آمد و رفت اس کثرت سے ہوئی کہ ان آنے جانے والوں پر پیغام بروں کا گمان گزرتا تھا۔

لورینز کہتا ہے کہ صرف بہت زیادہ جارحیت پسند جانور مستقل جوڑے بناتے ہیں، لیکن اود بلاؤ جیسے جانور بھی ہیں جو ساری زندگی کے لیے ایک ہی کو ساتھی بناتے ہیں اور اگرچہ اُن کے تیز دانت موثر ہتھیار بن سکتے ہیں، لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی نے اپنے ہم جنس کے خلاف انھیں استعمال کیا ہو۔ یہ جانور بندوں کی پُشت پر اور نہروں کے قریب بڑی ہوشیاری کے ساتھ جو مکان بناتے ہیں، اُن میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ اور چھچھوندروں کے ساتھ بھی بڑے ہم آہنگ انداز میں رہتے ہیں جن کے لیے وہ "تالاب" مہیا کرتے ہیں۔ وہ انھیں اس طرح اپنے گھروں میں خوش آمدید کہتے ہیں جیسے بجّو، گرگِ نیستانی یا لومڑیوں کا خیر مقدم کرتے ہیں اور انھیں دوست بھی بنا لیتے ہیں۔

ایسے جانوروں کو مسلسل لڑائی کے لیے وقت ہی کیسے مل سکتا ہے؟ یہ ظاہر ماہرین حیاتیات یہ محسوس نہیں کرتے کہ جنگل جانوروں کی ایک برادری ہوتا ہے۔ روزانہ قوتِ لایموت کا حصول بھی ایک تھکا دینے والا عمل ہے اور یقینی بھی نہیں۔

یہ جاننا شاید باعثِ حیرت ہو کہ بہت سے جانور دن کا خاصا حصہ اپنے آپ کو صاف رکھنے میں گزارتے ہیں اور ممکن ہو تو طفیلی کیڑوں سے بھی آزاد رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بندر اور لنگور ہر روز ایک دوسرے کے بال بنانے میں گھنٹوں مصروف رہتے ہیں۔ ایک سال کا ذکر ہے۔ ایک چھوٹی سی خوب صورت چوہیا میرے کمرے میں رہنے لگی۔ بعض اوقات میں چاہتا کہ وہ اپنی بال دار کھال کی صفائی بند کرے۔ وہ اتنے تسلسل سے یہ کام کرتی کہ میں دیکھتے دیکھتے اکتا جاتا۔ (جب میں نہاتا اور جہاں کھڑے ہو کر اپنے اُوپر پانی ڈالتا، وہ ہمیشہ بالکل سامنے پوزیشن لیتی اور اپنے غسل میں مصروف ہو جاتی)۔

یہ جو دُودھ پلانے والے جانور ہیں اور پیچیدگی کے بڑھتے ہوئے مدارج پر ہیں، یہی ہمارے آبا و اجداد ہیں۔ یہ اُن قدیم اور جنسی اعتبار سے مخالف مچھلیوں اور بطخوں کے بعد آئے۔ بہت سے دودھ پلانے والے جانوروں نے اپنے ہم جنسوں کی موت کو روکنے کے لیے کوئی آداب، کوئی طریقے وضع نہیں کیے، کیوں کہ انھیں ان کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ آپس میں بالکل نہیں لڑتے، ماسوائے ایسے وقت پر کہ جب کسی شکاری جانور نے اُن پر حملہ کیا ہو۔

ہمارے فوری مورثِ اعلا۔ لنگوروں۔ نے تو عدم جارحیت میں بہ ظاہر کمال پیدا کر رکھا ہے، کیوں کہ وہ نہ انفرادی طور پر اور نہ گروہی انداز میں لڑتے ہیں۔ لورینز کہتا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں پر اس لیے حملہ نہیں کرتے کہ ان کے پاس بھیڑیوں کے دانتوں اور شیر کے پنجوں جیسے موثر ہتھیار موجود نہیں ہیں، لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ایک جوان اور نر گوریلے کا بازو شیر کے پنجے جیسا مضبوط نہیں ہوتا ؟

ہم نہیں جانتے کہ کون سے دودھ پلانے والے جانور بندروں اور لنگوروں کی نسل کے قریب ترین مورثِ اعلا ہیں، لیکن آج غیر جارح جانور اتنی کافی تعداد میں موجود ہیں جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بندروں اور لنگوروں کے وجود میں آنے سے پہلے ابھرتے ہوئے دودھ پلانے والے جانوروں میں تعاون کا جذبہ ایک عادت بن رہا تھا۔ پس اب کیا ہوا ہے ؟ انسان واضح طور پر ایک جارحیت پسند جانور ہے۔ ہم امن پسندی بھی کھو بیٹھے ہیں اور اپنی جنس کے لوگوں کو قتل کرنے کے خلاف گریز سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ کیا اس کا کوئی سبب ہے یا اس کی کوئی تشریح ہو سکتی ہے ؟

جیسا کہ لورینز بتاتا ہے، جارحیت پسندی سکھائی جا سکتی ہے۔ جب اس پر عمل کیا جائے تو یہ شدید تر ہو جاتی ہے اور عمل نہ کیا جائے تو مدھم پڑ جاتی ہے۔ جب انسان برادریوں کی صورت میں بسنے لگے تو ہجوم کے باعث انھوں نے چڑچڑا پن سیکھ لیا، اُس وقت تک انھوں نے ہتھیاروں کا استعمال سیکھ رکھا تھا، جس کا مقصد ابتدا میں شکار مارنا تھا اور چوں کہ انھوں نے کم از کم ابتدائی بات چیت بھی سیکھ رکھی تھی، اس لیے وہ ایک دوسرے سے اثر قبول کر سکتے تھے اور دشمنی کی تلقین بھی کر سکتے تھے۔ وہ الفاظ کی قوّت سے پڑوس کے قبیلوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بھڑکا سکتے تھے۔ املاک یا اقتدار کا آرزو مند کوئی رہنما پروپیگنڈے کی مدد سے اپنے پیرؤوں میں جنگجویانہ طرزِ عمل کی تعریف کا جذبہ پیدا کر سکتا تھا۔

غالباً یہی طریقہ ہے جس سے جبلّی طور پر نہیں بلکہ تہذیبی طور پر انسانوں میں جارحیت پسندی اُبھری۔ جہاں تک کسی کو اذّیت پہنچانے میں مسرّت کا تعلق ہے، اس کا اظہار کوئی جانور نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ انسان میں اس جذبے کی موجودگی ایک نفسیاتی بیماری ہے۔

یہ عقیدہ کہ جنگ ہماری گھُٹّی میں ہے اور اس سے مفر نہیں، حقیقت میں ٹھیک نہیں۔ اس سے زیادہ کوئی چیز بھی انسان کے جنگی طرزِ عمل کو زیادہ موثر انداز میں طول نہیں دے سکتی۔ ایک

ناپسندیدہ ثقافتی ورثہ جلدی اور آسانی کے ساتھ ختم کیا جا سکتا ہے، لیکن جب تک آرڈرے اور لورینز کے بیان کے مطابق لوگ یہی سمجھیں گے کہ جنگ ہماری گھٹی، ہماری جبلّت میں ہے، اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا آسان نہیں۔

ایک سو سال سے زیادہ عرصہ پہلے ایک فلسفی ولیم ویہویل نے لکھا، "فطرت کے پورے چہرے پر تھیوری کا بہروپ مسلّط ہے"۔ لکھنے والوں پر یہ بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ یہ عقیدہ آسانی کے ساتھ قبول نہ کرلیں کہ بہروپ ہی فطرت کا حقیقی چہرہ ہے۔ ایک درہم برہم اور دھوکے باز دُنیا میں صرف فطرت ہی ایک جیتی جاگتی مستقل حقیقت ہے۔

اگر انشا پرداز اپنے غیر ثابت شدہ مفروضوں کو سچائی کے طور پر پیش کریں گے تو ویرانوں سے الگ تھلگ اور فریب کو سُن کر اُسے جانچنے کی قوّت سے عاری یہ مہذّب لوگ زندگی کے اُس ایک سہارے سے بھی محروم ہو جائیں گے، جو وجدانی طور پر اچھائی اور ہوش مندی کا احساس دلا سکتا ہے۔ اس کے بعد وجدان بھی کھو جائے گا۔ اس کے بعد پھر کسی کے لیے سوائے پاگل پن کے اور کیا باقی رہ جائے گا؟

حصّہ دوم

بین الاقوامی امن پر تحقیق

باب دوم ۔ الف

بورٹ ۔ وی اے رولنگ

امن کی جڑیں

"امن پر تحقیق" کی اصطلاح نسبتاً نئی ہے، یہی کیفیت جنگ اور امن کے مسائل میں اُس سائنسی دل چسپی کی ہے جو ساری دنیا میں اُبھر رہی ہے۔ اس نئی دل چسپی میں حیرت کا کوئی مقام نہیں۔ اس کے ڈانڈے جنگ کی نوعیت اور خطرات میں تبدیلیوں سے ملتے ہیں۔ اب یہ بات محسوس کی جاتی ہے کہ اُن تبدیلیوں سے یہ بات ممکن بن گئی ہے کہ جنگ کے ذریعہ سے ہماری تکنیکی طور پر اعلا ترقی یافتہ ثقافت اپنی ٹکنالوجی کے ہاتھوں برباد ہو سکتی ہے۔

جنگ ہمیشہ سے رہی ہے۔ ایک مورخ نے اندازہ کیا ہے کہ معلوم تاریخ کے تین ہزار چار سو سالوں کے عرصے میں صرف دو سو چونتیس سال ایسے ہیں، جن میں کسی جنگ کا سراغ نہیں ملتا۔ فرانس کے ایک ماہرِ عمرانیات گاستوں بوتھول نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے "صُلح کے آٹھ ہزار معاہدات"۔ جب لوگ یہ سوچیں کہ انسانی فطرت کے پیشِ نظر جنگ ناگزیر ہے تو یہ بات سمجھی جا سکتی ہے۔

جنگ کے اٹل اور ناگزیر ہونے کا تصوّر صدیوں سے چلا آتا ہے اور آبادی کے وسیع حلقوں میں اب بھی عام ہے۔ ۱۶۹۶ء میں فرانسس ڈینیل پاسٹورئیس نے سلسلۂ جنگ پر یوں قافیہ پیمائی کی، "جنگ افلاس پیدا کرتی ہے۔ افلاس امن لاتا ہے۔ لوگ تجارت کرتے ہیں۔ دولت بڑھتی ہے، دولت سے غرور جنم لیتا ہے۔ غرور جنگ کے لیے زمین تیار کرتا ہے۔ اور جنگ افلاس پیدا کرتی ہے۔ پس ہم اسی چکّر میں رہتے ہیں"۔ یہ بات بھی قابلِ فہم ہے کہ لوگوں نے ضرورت کو نیکی بنا لیا اور وہ جنگ کو ایک اچھی چیز، انسانیت کا اعلا اظہار اور ترقی

کا سبب قرار دیتے ہیں۔

جنگ اپنے جلو میں جو مصائب لاتی ہے اُن کے پیشِ نظر ایسا خیال حیران کُن ہے، لیکن جب جنگ ختم ہوتی ہے تو مُردے تو قبروں میں ہوتے ہی ہیں، اپاہج اور ناکارہ افراد کو بھی کسی حد تک پس منظر میں رکھا جاتا ہے۔ جنگ سے زندہ بچ نکلنے والے کچھ عرصے بعد پھر خوش حال ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی جانیں لینے کی مسلسل کوششوں کے باوجود نوعِ انسانی پھل پھول رہی ہے اور ترقّی کر رہی ہے۔ اس میں ہمارے آبا و اجداد کی فراست کا دخل نہیں، بلکہ بربادی کے امکانات سے بے خبری کا دخل ہے۔ اب ہم اس بے خبری کے شکار نہیں ہیں۔ ٹکنالوجی کے ارتقا نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ مخالف کو مکمّل طور پر برباد کر دیا جائے۔

اگر جنگ کی نوعیت بدلی ہے تو اصلاً اُن معاشرتی تبدیلیوں کے نتیجے میں بدلی ہے جو پچھلی چند صدیوں میں ہوئیں۔ ایک وہ وقت بھی تھا جب جنگ کرائے کے فوجیوں کی مدد سے لڑی جاتی تھی۔ پھر قومی پیشہ ور افواج کا زمانہ آیا۔ دورِ نپولین میں عوامی فوجیں وجود میں آئیں گویا جنگ کو جمہوری رنگ دیا گیا۔ اس سے جنگ کی نوعیت پر بھی اثر پڑا۔ جو محدود جنگ پیشہ ور لڑتے تھے اس میں کسی حد تک شجاعت اور فوجی ضابطۂ احترام کے عناصر برقرار رہے۔ عوامی فوجوں کے آنے سے یہ سب کچھ بدل گیا۔ چرچل نے درست طور پر اس بات پر زور دیا تھا کہ "جس لمحے جنگ میں جمہوریت دخیل ہوئی یا اس نے اپنے آپ کو میدانِ جنگ میں ٹھونس دیا، جنگ شریفوں کا کھیل نہ رہا۔" نتیجہ مکمّل جنگ کی صُورت میں نکلا، جن میں عوام بھی ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا ہو گئے۔

اسلحہ بندی میں تکنیکی ارتقا نے اس مکمّل جنگ کو مکمّل طور پر ناقابلِ برداشت بنا دیا۔ دھماکے کی قوّت، اس کی مار اور اس کی رفتار میں مزید انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ہتھیاروں کی بربادکن قوّت کئی لاکھ گنا ہو گئی ہے۔ اب اُن کی مار میں ساری دنیا آ گئی ہے اور ان کی رفتار اتنی تیز ہے کہ دفاع یا دوسرے لفظوں میں اُن کے خلاف موثّر بچاؤ ناممکن ہو گیا ہے۔

پہلے اسلحہ ایک فریق کی قوّت کو دوسرے فریق کے مقابلے میں لانے کا ایک ذریعہ تھا۔ اب وہ غیر محدود باہمی بربادی کا ذریعہ بن گیا ہے۔ اس میں مکمّل ایٹمی جنگ ایک ناقابلِ برداشت آفت بن جاتی ہے۔

لیکن کیا یہ نتیجہ جنگ کو روکنے میں مدد نہیں دے سکے گا؟ مملکت کی طاقت سیاسی طاقت ہوتی ہے اور "سیاسی طاقت قدرت پر، سامان پر یا اپنے آپ پر اقتدار کا نام نہیں

بلکہ دوسرے لوگوں کے دماغوں اور حرکات پر اقتدار کا نام ہے۔" کیا اس بہت بڑی فوجی قوت کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ مخالف اب جنگ کا خطرہ مول نہیں لیں گے؟ یہی وہ اُصول ہے جس کے ماتحت ناقابلِ برداشت بربادی کا خطرہ پیدا کر کے اُس کے ذریعہ سے امن کی تلاش ہوتی ہے۔" دہشت کے توازن" کے ذریعہ سے ایک ارادی یا جبری جنگ واقعی روکی جاسکتی ہے۔

فان کلاز وٹز نے دوسرے ذرائع سے خارجہ پالیسی کے تسلسل کو جنگ کا نام دیا یعنی فوجی طاقت کے ذریعہ سے کسی چیز کے حصول کی کوشش جس کے بارے میں ثابت ہو چکا ہو کہ وہ طاقت کے استعمال کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اب ایسی رائیں مناسب انداز میں ممکن نہیں رہیں پھر مونیو کلیائی یا ایٹمی جنگ اب قومی حکمتِ عملی کا ایک مناسب ذریعہ نہیں رہی۔ ممکن ہے کہ چھوٹے پیمانے کی جنگ کو ابھی یہ حیثیت حاصل ہو مثلاً ایٹمی طاقتوں کے درمیان" محدود جنگ" یا ناکافی انداز میں مسلح غیر ایٹمی مملکتوں کے درمیان جنگ۔ لیکن دونوں صورتوں میں اس کا دائرہ وسیع تر ہونے اور اس میں شدّت اختیار کرنے کا خطرہ موجود ہے، کیوں کہ ہارنے والا فریق پہلے سے بڑے ہتھیاروں کا استعمال شروع کر دیتا ہے۔ (گویا فوجی پیمانے میں وسعت پیدا کرتا ہے) ایک سبب یہ بھی ہے کہ چھوٹی مملکتوں کے درمیان اقتدار کی کش مکش سے ایٹمی طاقتیں بھی ملوّث ہو جاتی ہیں (گویا سیاسی پیمانے پر بھی وسعت پیدا ہو جاتی ہے)۔

چوں کہ ایٹمی جنگ میں قوموں اور اُن کی ثقافتوں کا وجود داؤ پر لگ جاتا ہے، اس لیے یہ کسی حادثے، غلط اندازے یا جنگ کے پیمانے میں وسعت کے نتیجے کے طور پر متصوّر ہوسکتی ہے۔ یا ایک غیر ارادی جنگ کی صورت میں اور بین الاقوامی ٹریفک میں خطرات کے دوران میں ایک حادثے کی حیثیت سے متصور ہوسکتی ہے۔

قدرتی طور پر ایک ملک کی خارجہ حکمتِ عملی پر فوجی قوّت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اس اعتماد میں کہ مخالف فریق اشتعال انگیز حکمتِ عملی کا جواب تشدّد سے نہیں دے گا، فوجی قوّت سے ایک اشتعال انگیز، بے پناہ خارجہ حکمتِ عملی اور سب کچھ داؤ پر لگانے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

صرف حقیقی طور پر اہم مفادات کے متاثر ہونے کی صورت میں غیر لچک دار موقف متوقع ہوسکتا ہے اور یہ کسی ملک کو ان مفادات کے تمام ذرائع و وسائل سے حفاظت کے لیے تیار کرتا ہے، لیکن غیر لچک دار موقف کب یقینی ہوتا ہے، اس نکتے پر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

"ماں اور بچہ" ——— ہنری مُور کی سنگ تراشی کا نمونہ

قومی ایٹمی اسلحہ بندی پہلے ہی ایک خطرناک خارجہ حکمتِ عملی ہے۔ ایٹمی اسلحہ بندی واقعی ایک ارادی ایٹمی جنگ کو روکتی ہے اور اس اعتبار سے امن کا ایک عنصر ہے، لیکن یہ ایک بے پناہ بین الاقوامی حکمتِ عملی کی طرف بھی لے جاتی ہے اور ــــ قابلِ اعتماد اسلحی کنٹرول کی صُورت میں ــــ ملک کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ایک "محدود جنگ" کرے۔ اس سے غیر ارادی ایٹمی جنگ کا خطرہ بڑھتا ہے اور پائیدار امن کا تیقّن نہیں ہوتا جو تکنیکی اعتبار سے اعلا ترقی یافتہ ممالک کا اہم مفاد ہے۔ قومی اسلحہ بندی مطلوبہ قومی سلامتی مہیّا نہیں کرتی، کیوں کہ نہ یہ غیر ارادی جنگ کو روک سکتی ہے اور نہ جنگ کی صُورت میں شہری آبادی کو بچا سکتی ہے۔

آج امن کی تحقیق میں جو دل چسپی موجود ہے اس کا بڑا محرّک جذبہ یہ ہے کہ اب اس خطرے کا احساس بڑھ رہا ہے، جس میں تکنیکی اعتبار سے اعلا ترقی یافتہ ثقافتیں اپنی ٹکنالوجی کی بدولت داخل ہو رہی ہیں۔

اس کے علاوہ بھی ایک محرک ہے۔ وہ موجودہ فوجی صورتِ حال کا اخلاقی پہلو ہے۔ اب بڑے پیمانے پر بلکہ کُلّی طور پر برباد کرنے والے ہتھیاروں کا سامنا ہے اور آج ان میں چند ہتھیاروں کا نشانہ شہری آبادی ہے، یعنی وہ بڑے شہروں کے خلاف استعمال کے لیے تیار ہوئے ہیں۔ "شہر دشمن داو پیچ" اس طریقے کی جنگ کا سرکاری جُزو ہے۔

فوجی ٹھکانے کی صورت میں شہری آبادی کا تصوّر ایک نسبتاً تازہ تصوّر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی جنگ کے عملی پہلوؤں نے قوموں کے روایتی قانون کو بدل ڈالا ہے اور بہ ظاہر جدید قوانینِ جنگ کھلے شہروں کی بربادی کی اجازت دیتے ہیں، لیکن جنگ کے ایسے طریقے پرانے زمانے کے فوجی ضابطۂ اخلاق سے عدم مطابقت رکھتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں جنگ سپاہیوں کے خلاف لڑی جاتی تھی، شہریوں کے خلاف نہیں۔

"شہر دشمن داؤ پیچ" جنگ کی اس سطح کو گرانے کے مترادف ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ عالمی جنگوں نے صرف مادّی اشیا ہی برباد نہیں کیں، بلکہ روحانی اقدار بھی برباد کر دیں، لیکن اخلاقی معیاروں کی یہ گراوٹ ہماری تہذیب میں عظمتِ انسانی پر زیادہ زور کے منافی ہے۔ ہمارے زمانے کا ممتاز ترین تصوّر یہ ہے کہ انسانی عظمت کو تسلیم کیا جائے اور وہ بھی "نسل، جنس، زبان یا مذہب کا امتیاز کیے بغیر" (اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۱)۔ کُلّی بربادی کے ہتھیاروں کا اس تصور سے بمشکل کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو مانی جا سکتی ہے کہ کُلّی بربادی کے ہتھیار اپنا اثر

دکھاتے ہیں اور" نسل، جنس، زبان یا مذہب کا امتیاز کیے بغیر"، لیکن یہ انسان اور انسانی زندگی کے احترام سے تو شاید ہی کوئی مطابقت رکھتے ہوں۔

دوسرے پہلوؤں سے بھی" شہر دشمن داو پیچ" کا تصور مرّوجہ خیالات اور مثبت بین الاقوامی قانون کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں ریڈ کراس کے معاہدات نے قوانینِ جنگ کو نئی صورت دے دی تھی۔ ان معاہدات کی رُو سے یرغمال میں لینا واضح طور پہ ممنوع قرار دیا گیا تھا (دورانِ جنگ میں شہریوں کی حفاظت سے تعلق رکھنے والے جنیوا کنونشن کی دفعہ ۳۴)، لیکن" شہر دشمن داو پیچ" کے تحت پُوری کی پُوری شہری آبادی اپنی حکومت کی نیک چلنی کی ضمانت کے طور پہ گویا یرغمال بن جاتی ہے۔ پس یرغمال کا تصوّر ختم نہیں ہوگا بلکہ درحقیقت اِسے توسیع دی گئی ہے، اور اِسے جمہوری بنا دیا گیا ہے۔

یہ متضاد صورت یہ ظاہر کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے کہ اسلحہ کی صورتِ حال اخلاقی طور پہ ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے اور اُس ثقافت کے لیے بھی باعثِ ذلّت ہے جس میں یہ پیدا ہوئی ہے۔" شہرِ دشمن داو پیچ" کا تصوّر اُن اخلاقی اقدار کو کھوکھلا کر دیتا ہے جن کا تحفّظ مقصود ہے۔

بہت سے ادیبوں نے کُلّی بربادی کے ہتھیاروں کی مذمّت بڑے واشگاف انداز میں کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس مذمّت سے نتیجہ کیا نکلا؟ یک طرفہ تخفیفِ اسلحہ؟ بعض یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ ایک ایسی صورتِ حال کا جذباتی، قابلِ فہم جواب ہے جسے اخلاقی اعتبار سے ناقابلِ جواز محسوس کیا جاتا ہے، لیکن یہ ایک انتہائی غیر دانش مندانہ جواب ہے۔ یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ آج اسلحہ کی جو صُورت ہے، وہ صدیوں پُرانے عمل کا نتیجہ ہے۔

ہمیں وہیں سے بات آغاز کرنا چاہیے جہاں تاریخ نے ہمیں رکھ دیا ہے۔ یہ دنیا طاقت کے توازن کی اصطلاحات میں سوچنے کی عادی بن چکی ہے۔ اگر اس ڈھانچے میں اچانک کوئی تبدیلی کی گئی تو اس سے تباہ کن نتائج اُبھر سکتے ہیں۔ جس فریق نے اسلحہ میں تخفیف نہیں کی اور جو اپنی قوت کی وجہ سے محفوظ ہے، اس کی خارجہ حکمتِ عملی میں پیش رفت کو اُس کے مخالف کی طاقت روک نہیں سکے گی۔ وہ اندھا دُھند اپنی خارجہ حکمتِ عملی پہ عمل کرے گا اور فریقِ ثانی اِسے ناقابلِ برداشت محسوس کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلحہ بندی کی طرف رجحان پھر شروع ہو جائے گا، لیکن اس کا نتیجہ حفظِ ماتقدّم کے عمل میں نکلے گا۔ پس یک طرفہ تخفیفِ اسلحہ جنگ کو فروغ دے سکتی ہے

اور ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی حوصلہ افزائی کر سکتی ہے۔

اگر ہم یہ جان لیں کہ اسلحہ بندی تحفظ مہیا نہیں کرتی اور یہ کہ ہتھیار ہماری ثقافت کو اخلاقی طور پر کھوکھلا کرتے ہیں تو صرف یہی ادراک ہمیں اجتماعی تخفیفِ اسلحہ کے لیے کوشش کے راستے پر ڈال سکتا ہے۔

عمومی تخفیفِ اسلحہ کوئی چھوٹا سا مسئلہ نہیں۔ اسے حاصل کیا جا سکتا ہے تو صرف ارتقائی انداز میں اور بڑی احتیاط کے ساتھ۔ بہرحال یہی وہ اندازِ فکر ہے جس سے پائدار امن کا حصول ممکن بن سکے گا، لیکن اس کے لیے قومی مملکت کی پوزیشن میں بڑی تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ عالمی تنظیم کو اتنا زیادہ مضبوط بنانا ہوگا کہ وہ بڑی حد تک قومی مملکتوں کے تحفظ اور سلامتی کی ذمے داری سنبھال لے۔

بین الاقوامی کنٹرول میں مکمل تخفیفِ اسلحہ اور خطرے اور تشدد پر قابو پانے کی مناسب شرائط کا تعین دنیا کے سامنے ایسے مسائل لاتے ہیں جن کی کوئی نظیر نہیں۔ یہ زندگی کے ایک ایسے ڈھانچے پر ضرب لگائیں گے جو خود انسانیت کی طرح قدیم ہے۔ یہ تبدیلی وجدان پر مبنی سرگرمی سے نہیں لائی جا سکتی۔ آج تک امن کی تحریکوں نے کوئی خاص عملی نتائج پیدا نہیں کیے حالانکہ یہ تحریکیں ہر دل عزیز تھیں، بالخصوص وہ تحریکیں جنھوں نے دو عالمی جنگوں کے درمیان نمو پایا۔

اچھے ارادے کافی نہیں ہوتے۔ انیسویں صدی کی امن تحریکوں نے تخفیفِ اسلحہ اور نوآبادیات کے خاتمے کے لیے جو نعرے بلند کیے اور دفترِ امن کے زیرِ اہتمام منعقدہ کانفرنسوں میں جو قراردادیں منظور کیں وہ ٹھیک تھیں، لیکن اس مسئلے پر شاذ ہی غور کیا گیا کہ انھیں عملی جامہ کس طرح پہنایا جائے۔ غالباً اس وقت بھی انھیں ناقابلِ حصول سمجھا جاتا تھا۔

جمعیتِ اقوام (لیگ آف نیشنز) کے دستور کی دفعہ ۸ میں کہا گیا کہ "امن کو برقرار رکھنے کے لیے تخفیفِ اسلحہ ضروری ہے"، لیکن اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ "قومی اسلحہ بندی میں اتنی ممکنہ کمی کی جائے جو قومی حفاظت کے تقاضے کے مطابق ہو"۔ چوں کہ ہتھیاروں کے بغیر نوآبادیاتی نظام کی حفاظت ناممکن تھی، اس لیے تخفیفِ اسلحہ ایک خالی خولی اصطلاح تھی۔ یہ ایک دفتری سچائی تھی جو پریشان کن حد تک مشترکہ فریب کے قریب تھی۔

ایٹمی ہتھیاروں نے تخفیفِ اسلحہ کے سلسلے میں ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اقوامِ متحدہ

کے منشور کو تخفیفِ اسلحہ سے شاید ہی کوئی واسطہ ہو۔ یہ اصلاً اجتماعی سلامتی کا تذکرہ کرتا ہے، لیکن یہ منشور ایٹمی ہتھیاروں سے قبل کے دَور سے تعلق رکھتا ہے۔ ایٹمی ٹکنالوجی قومی تخفیفِ اسلحہ کو ضروری بناتی ہے اور موجودہ نظام کو بدلنے کی ضرورت پر زور دیتی ہے یعنی یہ نظام جس میں مملکتوں کے تعلقات کی بنیاد فوجی طاقت پر قائم ہے۔

حقیقی صورتِ حال کا تقاضا یہی ہوگا، لیکن اِسے کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ انسان تخفیفِ اسلحہ کے مسئلے پر جتنا غور کرتا ہے اتنا ہی شدّت سے وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ مسئلہ پیچیدگی کے اعتبار سے نظیر نہیں رکھتا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجبور ہے کہ آج عمومی اور مکمل تخفیفِ اسلحہ کے بارے میں بیانات میں بڑی حد تک جس "سرکاری سچائی" کا ذکر آتا ہے وہ ہمیشہ خلوص پر مبنی نہیں ہوتا اور یہ بعض اوقات عوام النّاس کو گمراہ کرتا ہے۔

تخفیفِ اسلحہ کے اثرات انتہائی دُور رس ہوں گے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ تخفیفِ اسلحہ بہت تدریجی انداز میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے پہلے مناسب قدم کیا ہو سکتے ہیں؟ یہ عمل کس طرح چلے گا؟ قومی فوجی مشینری کو توڑنے کے ہر مرحلے میں کون سے تعمیری اقدامات درکار ہیں؟

یہ تکنیکی اور فوجی نیز معاشی اور سیاسی مسائل ہیں، لیکن اس وقت سب سے بڑے مسائل سیاسی ہیں۔ اُن کا تعلق حکومتوں اور عوام کے طرزِ عمل سے ہے۔ ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے تحقیق ناگزیر ہے۔

اسلحی صورتِ حال کا اخلاقی استرداد جو اصلاً اجتماعی بربادی کے موجودہ ہتھیاروں پر مبنی ہے، لیکن پوری روایتی فوجی تنظیم کی جڑوں پر ضرب لگاتا ہے، وہ بھی امن پر تحقیق میں موجودہ دلچسپی کا ایک محرک ہے۔

ایک تیسرے محرک کا ذکر بھی ہو سکتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انسان بیرونی دشمنوں کے خلاف جس سیاسی یونٹ میں حفاظت ڈھونڈھتا ہے، اس کی جسامت کا دار و مدار کم و بیش موجودہ ہتھیاروں کی مار اور نفوذ پر ہوتا ہے۔ منفرد سیاسی یونٹوں کے اعتبار سے قلعے، شہر یا ضلع کو غائب ہونا پڑا، کیوں کہ ان کا دفاع ممکن نہ رہا۔ آج کے راکٹوں کی مار اور نفوذ مملکت کو ایسا یونٹ بناتا ہے جس کی حفاظت اب ممکن نہیں رہی بلکہ اب علاقائی گروپ بھی ایسے دفاع کے قابل نہیں رہے جدید ہتھیار عالم گیر صلاحیت رکھتے ہیں، اس لیے یہ ایک ایسی عالمی تنظیم کے متقاضی ہیں جو مملکتوں

کی سلامتی کی ذمے داری سنبھال سکے۔

ایٹمی ہتھیاروں اور راکٹوں کا دَور ایک ایسا دَور ہے جس میں قومی مملکت کے پاس پہلے سے عظیم تر فوجی صلاحیت تو موجود ہے، لیکن وہ اب سلامتی کی ضمانت نہیں دے سکتی، اور یہی ایک ایسا دَور بھی ہے جس میں بین الاقوامی تنظیم میں دُور رس تبدیلیاں ضرور ہونی چاہئیں۔ یہ ممکن نہیں کہ یہ کام وہ سیاست داں کر سکیں جن کے پاس روایتی دانش پر مبنی ایک کم میعادی حکمتِ عملی ہوتی ہے۔ اس کام کا تقاضا تو یہ ہے کہ وسیع سائنسی تیاری کی جائے۔ صرف اس نظام کے بارے میں جو آخرِ کار قائم کرنا پڑے گا بلکہ ہر اُس چیز کے لیے بھی جو آبادیوں کو آخری نصب العین قبول کرنے کے لیے تیار کرنے کے سلسلے میں درکار ہوگی۔

پچھلے زمانوں میں جنگ پر بہت سے مطالعے شائع ہوئے۔ سچ پوچھیے تو جنگ کے اسباب پر بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ یہ کتابیں اچھی ہیں، لیکن اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ان زیادہ تر پرانی کتابوں میں فان کلازوٹز کے تصوّر کی جنگ کا ذکر ہے یعنی ارادی جنگ کا۔ ان میں غیر ارادی جنگ یا ٹریفک کے حادثے کی طرح جنگ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

پرانے نظریات میں اکثر جنگ کی ذمّے داری چھوٹے گروہوں مثلاً جاہ طلب بادشاہوں، جنگ جُو جرنیلوں اور منافع خور اسلحہ سازوں پر ڈالی جاتی تھی۔ اگر کوئی غیر ارادی جنگ کا سبب دریافت کرے اور جس میں خطرناک خارجہ حکمتِ عملی کا سبب بھی شامل ہوگا تو زیادہ امکان یہی ہے کہ ایسے اسباب بہت عمومی عناصر اور فکر و عمل کی مروّجہ عادات میں دیکھے جائیں۔ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ روایتی عادات اور طرزہائے عمل کتنے مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔ جنگ کا سبب موجود عمومی صورتِ حال سے گہرے طور پر منسلک ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں سے یہی اشارہ ملتا ہے کہ جنگ کا سبب بھی جمہوری عمل کے تحت ہے۔

اگر یہ درست ہے تو اس سے مسئلہ زیادہ مشکل بن جاتا ہے جب تک خرابی چھوٹے اعلا گروہوں میں مرتکز ہو اُن کے اثر و رسوخ کو توڑنے کی کوشش ممکن ہے، لیکن اگر ہمارا واسطہ اُن رجحانات و آرا سے ہے جو لوگوں میں مجموعی طور پر رچے بسے ہوں تو ایسی صورت میں پائدار امن کے حالات پیدا کرنے کے لیے راستے تلاش کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ بات بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ اب تک ہمیں اُن اسباب کے بارے میں بہت کم علم ہے جو خطرناک خارجہ حکمتِ عملی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ارادی جنگ کے سبب کے مسئلے کی طرح

یہاں بھی ہمیں فرد، مملکت اور دنیا سے ابھرنے والے عناصر کے ایک امتزاج سے سابقہ پڑتا ہے۔ کیا جنگ اس لیے ناگزیر ہے کہ انسان قدرتی طور پر جارحیت پسند ہے؟ پھر کون سی چیز اس جارحیت پسندی کو نمو دیتی ہے؟ کیا یہ انسانی زندگی کا ایک ضروری جُزو ہے یا مایوسی کے خلاف ایک ردِّ عمل ہے یا یہ ایک موجود ڈھانچے کی نقل اور مطابقت سے حاصل شدہ ایک ثقافتی مظہر ہے؟ فحاشی اور تشدّد کے امتزاج کا کیا اثر ہوتا ہے اور اُن فلموں کا، جن میں تشدّد نمایاں ہوتا ہے؟ اور مملکت کے عناصر کون سے ہوتے ہیں؟ یہاں رائے عامّہ کیا حصّہ لیتی ہے؟ رائے عامّہ کیسے بنتی ہے؟

اور وہ کون سے عناصر ہیں جو مملکتوں کے درمیان تعلقات میں کارفرما ہوتے ہیں؟ کیا ارضی سیاست فیصلہ کُن عنصر بنتی ہے؟ کیا تُوسّال کے خیال کے مطابق آبادی کا حد سے بڑھ جانا اہم ترین عنصر ہے؟ یہاں تاریخ کیا کردار ادا کرتی ہے؟ لوگ جو رسمی تصوّرات ایک دوسرے کے بارے میں رکھتے ہیں اُن کی اصل کیا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ بیرونی ممالک پر عمومی عدم اعتماد ختم ہو جائے؟ کیا اب بھی مسابقت تعاون سے زیادہ منافع بخش ہے؟ اور اگر نہیں، تو مسابقت کے موجودہ ڈھانچے کو کس طرح بدلا جا سکتا ہے؟

میں صرف چند سوالات کا ذکر کرتا ہوں۔ ان سے سینکڑوں اور سوالات بھی اُبھر سکتے ہیں۔ سوالات کا ذکر صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کیا گیا ہے کہ مسئلے کی بہتر تفہیم کے لیے بہت سے علوم کا تعاون ضروری ہے، مثلاً نفسیات، تاریخ، معاشیات، عمرانیات، علمِ قانون، بلکہ مذہبیات اور آرٹ کی تاریخ بھی، کیوں کہ افراد اور گروہ کے طرز ہائے عمل اور آرا میں چرچ اور آرٹ بھی اہم حصہ لیتے ہیں۔

جنگ اور امن کے سلسلے میں یہ رجحانات و آرا عظیم ترین اہمیت کی حامل ہیں اور یہاں بھی ہمارے لیے ضروری ہے کہ "ارادی جنگ" کے تصوّر کے ساتھ ساتھ "غیر ارادی جنگ" کی عظیم اہمیت پر زور دیں۔ جنگ کے خلاف آہستہ آہستہ ایک عام احساس پیدا ہو رہا ہے۔ جنگ سے نفرت بڑھ رہی ہے، لیکن یہی صورت "خطرناک خارجہ حکمتِ عملی" کے سلسلے میں پیدا نہیں ہوئی۔ خارجہ حکمتِ عملی کے معاملے میں بہت سی باتیں اُسی طرح ہیں جیسے ہمیشہ سے چلی آتی ہیں مثلاً قومی یا علاقائی طاقت کے ذریعہ سے سلامتی۔ اور کبھی کبھی کوئی اشتعال انگیزی بشرطے کہ دوسرے فریق کو ڈرا کر جھکانے کی توقع ہو۔ یہ ایک ایسا طرزِ عمل ہے جو "غیر ارادی

جنگ" کے تصور پر ناکافی توجہ دیتا ہے۔

اس حوالے سے میں مختصر طور پر یہ کہوں گا کہ جب اسلحی صورتِ حال، بین الاقوامی تنظیم اور جنگ کے امتناع کے نتیجے میں جنگ پس منظر میں چلی جاتی ہے تو خانہ جنگی عظیم تر اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے۔ خانہ جنگی اکثر ایک ایسی محدود "جنگ بذریعہ نیابت" ہوتی ہے جس میں باہر کے لوگ ایک اصلاً خالص داخلی کش مکش کو بین الاقوامی رنگ دیتے ہیں اور اس طرح اُس کی طوالت اور شدت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس لیے خانہ جنگی بھی جنگ و صلح کے علم کے دائرے میں داخل ہے۔

مکمل جنگ کو روکنے کے لیے عالمی امن کا کون سا نظام قائم کرنا ہو گا؟

ایک موثر امن پسند حکمتِ عملی کے لیے کون کون سے تقاضوں کی تکمیل درکار ہے؟ بین الاقوامی ٹریفک کی حفاظت کے تیقن کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے؟ ظاہر ہے کہ امن کے لیے مادی اور روحانی، دونوں دائروں میں قربانیاں دینی ہوں گی۔ لمبے عرصے کی سوچ سوچیے تو اگر امیر اور غریب قوموں کے درمیان خلا آج کی طرح وسیع ہوتا چلا گیا تو آگے چل کر جنگ ناگزیر ہو گی۔ پس ضرورت یہ ہے کہ ترقی پذیر ملکوں میں معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے پوری سرگرمی سے کام لیا جائے۔ بہرحال اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان ملکوں میں جو معاشی تبدیلیاں آئیں گی، اُن کے بطن سے عظیم معاشرتی تبدیلیاں بھی جنم لیں گی اور وہ بے چینی اور جارحیت بھی آئے گی جو ایسی تبدیلیوں کے لوازم ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ ایک غیر مسلح دنیا کی نوعیت کے واضح تصور تک تدریجی انداز میں پہنچا جائے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مادی قربانیاں ضروری ہوں گی۔ یہ بات آسانی کے ساتھ کہہ دی جاتی ہے کہ بے شک امن کے لیے قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، لیکن یہ محض مادی "قربانیوں" کا معاملہ نہیں، روحانی معاملات میں بھی مراعات دینی ہوں گی۔ اس وجہ سے بھی مخالفت پر قابو پانا ہو گا کہ ایک غیر مسلح دنیا کی روحانی فضا آج کی روحانی فضا سے یقیناً مختلف ہو گی۔ اس سے حالات آسان تر نہیں ہوں گے۔

روایتی طرزِ عمل آسان ہوتا ہے۔ اس کا تعین صرف اُن خیالات پر ہوتا ہے جو کسی شخص کے اپنے حلقے میں رائج ہوتے ہیں۔ ایسی فضا میں کوئی چیز سفید ہوتی ہے یا سیاہ، صحیح ہوتی ہے یا غلط اور اس میں انسان جس چیز کو صحیح سمجھتا ہے اس کے لیے جنگ کا خطرہ مول لینے کو تیار

ہوتا ہے۔ سلامتی کے ایک عالم گیر نظام میں ایک عظیم تر کُل کا جُزو ہونا پڑتا ہے۔ " اجنبی" خیالات کے وجود کا حق تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ روادارانہ طرزِ عمل، کچھ لو اور کچھ دو کا جذبہ، مناسب انداز میں عمل اور مصالحت پر رضامندی بھی اس کے تقاضے ہیں۔

امن برقرار رکھنے کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے؟ اس سلسلے میں کوئی رائے قائم کرنا اس لیے بھی اہم ہے کہ جب ہم ایسا کریں گے تو یہ بات ہم پر واضح ہو جائے گی کہ ہم اب بھی ایک اہم ضرورت سے کتنے فاصلے پر ہیں۔

اس کے باوجود جب ہم وہ چیز معلوم کر لیتے ہیں جو ہماری بقا کے لیے ضروری ہے تو پھر بھی ہم اس سوال کو نہیں چھو پاتے کہ آیا بقا کے لیے جو کچھ ضروری ہے وہ حاصل بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ہر قوم اور ہر نسل کے پاس عمل کا ایک تنگ سا دائرہ ہوتا ہے۔ اس لیئے صرف تدریجی اور چھوٹے قدم اٹھائے جا سکتے ہیں۔

اس سے سوالات کا چوتھا سلسلہ ابھرتا ہے۔ کیا ضروری بات کو ممکن بنایا جا سکتا ہے؟ دست یاب وقت غیر محدود نہیں ہے، مسئلے کا فوری پہلو بھی موجود ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آیا

افراد اور قوموں کو تعلیم اور دوسرے وسائل سے اس بات پر آمادہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ "ضروری امر" کو ممکن بنا دیں لیکن استدلال اور عام فہم و فراست کی مدد سے تبدیلی لانے کا انسانی راستہ "ممکن ہے؟ انسان" غیر عقلیت پسند آدمی" بھی ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنی آرا اور عمل میں بڑی حد تک وجدان اور جذبے اور روایت سے متاثر ہو جاتا ہے۔ استدلال، بالخصوص انسانی گروہ میں بہت کم اثر رکھتا ہے اور صرف وہی اثر غالب رہتا ہے جو جذباتی انداز سے محسوس کیا جاسکے، براہ راست اور فوری ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی عوام کو متاثر کرنا چاہتا ہے تو وہ قوم پرستی یا آزادی یا اقتدار کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی سلامتی جیسے بنیادی طریقوں سے اغماض نہیں برت سکتا۔

یونیسکو کے صدر دفاتر کے باغ میں عظیم قوارے والی چٹان پر جو جاپانی علامت کندہ ہے، اس کا مطلب ہے "امن"۔ یہ علامت ایک پرانی چینی علامت سے ماخوذ ہے جس میں ایک اناج کی بالی (دائیں جانب ہے) اور ایک دہن (نچلی بائیں جانب)۔

یونیسکو۔ ڈومی نیک راجر

بین الاقوامی تعلقات کا رائج ڈھانچا عدم اعتماد اور خوف کا ڈھانچا ہے۔ کیا اسے تبدیل کرنا ممکن ہے ؟ بعض بنیادی انسانی رجحانات" اس حد تک ذہن کا حصہ بن چکے ہیں اور اتنے پرانے عرصے سے چلے آتے ہیں کہ انسان کبھی اُن کا حقیقی شعور نہیں رکھتے۔ وہ ان رجحانات کو نہیں دیکھتے، لیکن ان کی وساطت سے دوسری چیزوں پر نظر ڈالتے ہیں"۔ اہم سوال یہ ہے کہ ایسے طریقے کس حد تک دریافت کیے جا سکتے ہیں جن سے افراد اور اقوام کو امن کے تقاضوں کے تیقن کے لیے "طویل المیعاد مفاد" کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا جا سکے۔

یہاں اُن سوالات کا ہمارا مختصر جائزہ ختم ہوتا ہے جو امن پر تحقیق کا تعین کرتے ہیں۔ ان کا جواب دینے کے لیے ایسی گہری سائنسی تفتیش درکار ہے جس میں قریب قریب تمام سائنسی علوم سے مدد لینی پڑے گی۔ ان مختلف علوم کے درمیان گہرا تعاون نہایت ضروری ہے۔

یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے۔ افراد اور گروہوں کا اور افراد اور گروہوں کے درمیان روابط کا ایسی تحقیق میں موجودہ صورتِ حال کو نقطۂ آغاز بنانا ہوگا جو تاریخی ارتقا کی تخلیق کی حیثیت سے پُرانے زمانے سے مستحکم تصورات اور مفادات کی روشنی میں زیادہ شدید روپ لے چکی ہے۔ ہر گروہ کا تاریخی ارتقا ایک ساتھ اکٹھے بسر کیے ہوئے سُکھ اور دُکھ کی گہری یادوں کی بنا پر اسے دوسرے گروہوں سے مختلف بناتا ہے۔ اس لیے احسن یہی ہے کہ امن کی تحقیق ابتدائی طور پر ہر منفرد سیاسی اجتماعیت میں کی جائے۔ ہر اجتماعیت کی اپنی امتیازی خصوصیات اور کمزوریاں ہوتی ہیں، اس لیے ہر اجتماعیت میں تبدیلی کے اپنے طریقے اور امکانات ہو سکتے ہیں۔

ہر مملکت میں امن پر تحقیق اس لیے بھی اہم ہے کیوں کہ خیال کے قومی انداز کی حفاظت کے لیے بعض نکات پر روحانی علاحدگی کی طرف رجحان ہوتا ہے۔

ہر ملک میں امن کی تحقیق علاحدہ علاحدہ ہو تو اس سے سچائی کو قومیانے کے رجحان کا بھی توڑ ہو سکتا ہے۔ عمرانی علوم کی تحقیق قومیانے کے اس عمل کو حقیقت کے طور پر تسلیم کرے گی، لیکن یہ امکان بھی ہے کہ وہ اسے تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے بدترین تجاویزات کو بھی روک سکے گی۔

ایک اور پہلو ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ ہماری دنیا اس انداز میں منظم نہیں ہے کہ تکنیکی ارتقا کے لائے ہوئے خطرات سے عہدہ برآ ہو سکے تو پھر یہ لازمی ہے کہ تبدیلیاں لائی جائیں۔ یہ حقیقت شک و شبہ سے بالا ہے۔ بہرحال فی الحال ہم اس مسئلے کو التوا میں ڈال سکتے ہیں کہ یہ تبدیلیاں کن کن دوائر کا احاطہ کریں گی۔ جو دبستانِ فکر غالب ہے اُس کے نزدیک یہ

تبدیلیاں اُن خطوط پر ہوں گی کہ اسلحہ بندی کو عمومی اور مکمل طور پر ختم کر دیا جائے اور سلامتی کا تیقن عالمی تنظیم کے توسط سے ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تبدیلیاں ہر جگہ لانی پڑیں گی۔ سلامتی یک طرفہ اقدامات سے حاصل نہیں ہو سکتی خواہ وہ کسی قسم کے بھی ہوں۔ یہ تو مشترکہ مساعی اور متحدہ عمل ہی کے توسط سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ملک کے اندر تبدیلیاں صرف اس صورت میں ممکن ہیں کہ لمبے عرصے کے مشترکہ مفادات کو تسلیم کرتے ہوئے دوسرے ملکوں میں بھی مناسب اور کافی اقدامات کیے جائیں۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ پائدار امن کی خاطر لائی جانے والی تبدیلیوں کے لیے سائنسی تحقیق ناگزیر ہے تو پھر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ایسی تحقیق ہر جگہ ہو۔ اگر امن کی تحقیق کو موثر ہونا ہے تو اس کی فراہم کردہ مفاہمت کو ہر جگہ عوامی املاک بنانا ہوگا اور اس کی پیش رفت ہر ملک میں تحقیقِ امن کے اداروں کے وجود سے ہو سکتی ہے۔

ہاں باہمی انحصار کا جو نتیجہ ہمارے سامنے ہے وہ اُس نتیجے سے زیادہ واشگاف اور ظاہر ہے جس نے بین الاقوامی دفترِ محنت کے قیام میں مدد دی۔ مزدور طبقے کے معاشرتی حالات میں قومی سطح پر بہتری اُس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک کہ دوسرے ممالک میں بھی ایک ساتھ ایسا نہ ہوتا۔ چناں چہ ۱۹۱۹ء میں مزدور قوانین کو بین الاقوامی رنگ دینے کی کوشش ہوئی۔ تخفیفِ اسلحہ کے ذریعہ سے بین الاقوامی سلامتی بھی قدرتی طور پر صرف اُس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ قومی اسلحہ بندی کے ذریعہ سے سلامتی کے تصور کو پوری دنیا میں ترک کر دیا جائے اور مناسب اقدامات عالمی طور پر قبول کیے جائیں۔

اس لیے پہلا تقاضا یہ ہے کہ تحقیقِ امن کا دَور دورہ تمام ممالک اور اقوام میں ہو۔ اس تحقیق کا آغاز تاریخ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی قومی صورتِ حال کی خصوصیات سے ہو سکتا ہے۔ جو تحقیقِ امن مخصوص قومی اندازِ فکر سے اُبھرے گی اُسے قومی اعتماد حاصل ہوگا اور اس طرح وہ سوچ کے قومی انداز کو متاثر کر سکے گی۔

بہر حال اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ صداقت کو تو میانے کا عمل قومی سطح پر کی ہوئی امن تحقیق پر بھی اثر ڈالے گا اور یہی اس ضرورت کی خصوصی وجہ ہے کہ جنگ اور امن کے علم میں بین الاقوامی رابطے اور تعاون کا سلسلہ چلے۔

ایک اور خصوصی وجہ یہ ہے کہ امن کی تحقیق ساری دنیا کو متاثر کرنے والے واقعات سے

رشتہ و تعلق رکھتی ہے۔ پس اہم ترین بات یہ ہے کہ ہر جگہ کی "صورتِ حال" سے آگہی ہو۔ یہ فُضلا کا تعاون ہی ہے جو دنیا کے مختلف حصّوں میں سوچی اور محسوس کی جانے والی باتوں کی مفاہمت میں مدد دے سکتا ہے۔ اسی سے یہ تعیّن ہو سکے گا کہ تبدیلیاں لانے کے لیے متحدہ کوشش کو بارآور کرنے کی خاطر عمل کے امکانات کیا کیا ہیں؟

بین الاقوامی سائنسی تعاون کی ان خصوصی وجوہ کے علاوہ ایسی عمومی وجوہ بھی ہیں کہ خیال افروزی کا عمل جاری رہے۔ نئے خیالات جنم پاتے رہیں۔ مختلف شعبوں میں اس عمل کے مفید نتائج ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں۔

بین الاقوامی رابطے اور تعاون کی ضرورت نے بین الاقوامی امن تحقیق ایسوسی ایشن کے قیام میں مدد دی۔ ایسوسی ایشن کا مقصد یہ ہے کہ عالمی نظم، امن اور سلامتی کی پیش رفت کے لیے عالمی اور بین الاقوامی امن تحقیق کے سلسلے میں ٹھوس کردار ادا کرے۔ یہ بات اس صورت میں ممکن ہے کہ بہت سے لوگ سرگرم تائید کے لیے تیار ہوں۔

باب دوم - ب

وادم اردا توفسکی

امن کا چیلنج

اوائل جون ۱۹۷۰ء کا ذکر ہے۔ ہم سٹراس بورگ میں صحافیوں کے ایک بین الاقوامی اجلاس میں شریک تھے۔ ہم نے کوشش کی کہ بیرونی دنیا کو بھول جائیں اور ٹکنالوجی کی حالیہ ترقی اور صحافت پراس کے بڑھتے ہوئے اثر پر تبادلِ خیال میں ایک خوش گوار ہفتہ گزاریں۔

ہم نے اپنے محدود انداز میں کوشش کی کہ اُس بڑھتی ہوئی ہر دل عزیز مشق میں حصّہ لیں جسے "علمِ مستقبل شناسی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جو بعض اوقات سائنسی افسانے کے بالکل قریب آجاتی ہے۔ ہم نے کل کی دنیا کا تصوّر کیا۔ بالخصوص اس بات کا کہ کل صحافت کے "دورِ زرّیں" کی کیفیت کیا ہوگی۔ ہم نے دیکھا کہ خلا میں مصنوعی سیارے گردش کر رہے ہیں اور دنیا کے ہر کونے میں عکسی اخبار نشر کر رہے ہیں کوئی بھی خاندان محض بٹن دبا کر عالمی اخبارات میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے حاصل کر سکے گا۔ ہم نے ان میں سے کچھ "بولتے چالتے اخباروں" کا تصوّر بھی کیا جو زیادہ ذاتی دلچسپی کا موجب ہوں گے۔ ہم نے ذہن کے پردے پر دیکھا کہ نامہ نگار موقع پر خبر حاصل کر کے خود کار کمپوزنگ مشینوں کو براہِ راست بھیج رہے ہیں اور لیزر کی قسم کی شعاعوں کے توسّط سے صفحۂ اوّل پر چھپنے والی خبریں فی الفور پہنچ رہی ہیں۔

ہمارا چھوٹا سا بین الاقوامی گروپ فرانس، برطانیۂ عظمیٰ، سوویت یونین، امریکا، عرب ممالک، جاپان، یوگوسلاویہ، آئرلینڈ، چیکوسلوواکیہ اور دوسرے ملکوں کے صحافیوں پر مشتمل تھا۔ ہم اپنے کام میں اس حد تک آگے چلے گئے کہ ہم نے یہ سوچا کہ ان جدّتوں کے اجرا میں کتنا عرصہ صرف ہوگا، بیس سال، پچاس سال یا ایک سو سال!

اس بات پر ایک آن کہا اتفاق رائے تھا کہ سیاست کے تذکرے سے گریز کیا جائے حال آنکہ اسی ہفتے مشرقِ وسطیٰ میں جنگ چھڑ چکی تھی اور اُس وقت کوئی یہ پیش گوئی نہیں کر سکتا تھا کہ کش مکش کو محدود کرنا ممکن ہے یا یہ آخرِ کار دوسرے ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ مواصلات کی صنعت کی مستقبل کی ترّقی پر تبادلِ خیال بہ ظاہر اس قدرتی مفروضے پر مبنی تھا کہ جس مستقبل کا پہلے سے اندازہ ہو سکتا ہے اس کے دوران میں دنیا امن کے ساتھ ترّقی کے راستے پر گامزن رہے گی۔

ظاہر ہے پیشہ ور فوجی افراد کے ایک نسبتاً مختصر گروہ کے سوا کوئی بھی اپنے سامنے کھڑی ہوئی ایک عالمی جنگ کے تناظر میں مستقبل کے بارے میں وسیع منصوبے نہیں بنا سکتا۔ جب کوئی ماہرِ فنِ تعمیر ایک کئی منزلہ نئی عمارت کی بنیاد ڈالتا ہے، باغبان ایک نئے پارک کا نقشہ تیار کرتا ہے اور مصوّر کسی نئی تصویر پر کام شروع کرتا ہے تو وہ سب یہی سوچتے ہیں کہ مستقبل میں تفریح کا سامان مہیا ہوگا اور معاشرے کو سال ہا سال بعد بلکہ نسلاً بعد نسلٍ اُن کے کام سے فائدہ پہنچے گا۔ دوسرے لفظوں میں امن کی ضرورت انسان کے لیے ویسی ہی قدرتی ضرورت ہے جیسی اوکسی جن کی ضرورت اور انسان کی اہم ترین جبلّت یہی ہے کہ وہ زندہ رہے!

سوئٹزرلینڈ کے ایک سائنس داں ژاں ژاک بابل نے اندازہ کیا ہے کہ تاریخ کے دوران میں انسان نے ساڑھے چودہ ہزار بڑی اور چھوٹی جنگیں لڑی ہیں۔ ایک فرانسیسی ماہرِ عمرانیات گاستوں بوتھول ایک ایسی کتاب کا مصنّف ہے جس کا نام "صلح کے آٹھ ہزار معاہدات" ہے۔ انسان کے لیے "زرّیں دور" وہ ہے جس میں ساری دُنیا میں امن رہا ہو۔ کسی نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ دَور بہت مختصر رہا ہے اور دو سو بیس سال سے زیادہ نہیں رہا۔

میرے خیال میں یہاں ہمیں رُک کر ایک لمحے کے لیے سوچنا چاہیے اور اپنے آپ سے دریافت کرنا چاہیے کہ اُن ساڑھے چودہ ہزار جنگوں نے تہذیب کی پیش قدمی کو کتنا روکا ہے۔

کارل مارکس کے فلسفے کے بارے میں لوگوں کی آرا میں کتنا ہی وسیع اختلاف کیوں نہ ہو، لیکن میرے نزدیک جنگ کے بارے میں اس کے اس بیان سے کوئی بھی اختلاف نہیں کر سکتا کہ "ایک خالص معاشی نقطۂ نگاہ سے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے سرمائے کا ایک حصّہ سمندر میں پھینک دے۔"

دوسری عالمی جنگ کے دوران میں برسرِجنگ ممالک کی ساٹھ فی صد قومی آمدنی جنگ میں جھونک دی گئی اور ہمیشہ کے لیے ضائع ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس ہول ناک خون خرابے میں پچاس ملیون انسان پانی کے سمندر میں نہیں، خون کے سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔

بہ ظاہر یہ ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ ایک نئی عالمی جنگ، ایک ایٹمی ہتھیاروں سے لڑی جانے والی ایک جنگ کے خوفناک نتائج کو ایک بار پھر بیان کیا جائے۔ اس سے جو بربادی ہوگی وہ ہمارے ممکنہ تصوّر سے کہیں زیادہ ہوگی۔ عالمی صحافت نے متعدد مرتبہ اعداد و شمار پیش کیے ہیں جو کسی صورت میں بھی مبالغہ آمیز نہیں ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ پہلے ایٹمی حملے کے نتیجے میں سات سو سے آٹھ سو ملیون افراد موت کے گھاٹ اُتر جائیں گے۔

پس یہ بات واضح ہے کہ عقلِ سلیم ہو یا انسانیت کی رُوح، نوعِ انسانی کے لیے ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے ایک پائدار امن کے قیام کا راستہ۔ اس کے باوجود یہ حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ہم ایک ناپائدار، ڈھلمل امن کی دُنیا میں رہتے ہیں۔ ہم نے وقتاً فوقتاً دیکھا کہ کوریا، الجزائر، سویز، ویت نام اور مشرقِ وسطیٰ میں جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ آج امن کے لیے یہ بھی ایک بڑا خطرہ ہے کہ قوموں کی اکثریت میں ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی کا رجحان موجود ہے۔ لندن یونی ورسٹی کے پروفیسر جارج شوارٹزن برگر درست کہتے تھے کہ قوموں کے درمیان آج کے تعلقات باہمی بداعتمادی اور دوسری قوموں کی نیتوں کے بارے میں مستقل خوف سے بھرپور ہیں۔

اس لیے یہ بات منطقی معلوم ہوتی ہے کہ قومیں اپنے اپنے دفاعی وسائل کی تکمیل میں مصروف ہیں، لیکن بہ ظاہر ایسا کوئی فارمولا موجود نہیں جس سے ایک "مسلّح دنیا" اور اس سے اُبھرنے والے ایسے شکوک و شبہات سے نجات پائی جا سکے جو خوف اور بے اعتمادی کی ٹھوس بنیاد یعنی اسلحہ کے خاتمے سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔

یہ صرف انیسویں صدی کے اواخر کا ذکر ہے اور وہ بھی ہمارے اپنے وقتوں کی جنگوں کے درمیان مختصر وقفوں کا کہ عالمی سیاسی تفکر عمومی تخفیفِ اسلحہ کے نظریے پر سنجیدگی سے غور پر آمادہ ہوا ہے۔ ماضی میں تخفیفِ اسلحہ یا غیر مسلّح کرنے کا اقدام کسی ملک پر اُس کی شکست کے بعد نافذ کیا جاتا تھا۔

شکست خوردہ ملک سے سارے ہتھیار لے لیے جاتے تھے، اُس کی قلعہ بندیاں برباد

فوٹو ج ہومز۔لیبل

جنگ کے ہتھیار (اوپر) اور امن کے وسائل (بائیں جانب) لیکن ایک ٹینک پر ٹریکٹر سے کہیں زیادہ لاگت آتی ہے اور قومیں جدید اسلحہ پر مشتمل ذخیروں کو برقرار رکھنے کی خاطر اربوں اور کھربوں روپے صرف کرتی ہیں. مثلاً پورے ساز و سامان سے آراستہ ایک نئے بم بار کی قیمت پچاس ہزار ٹریکٹروں، یا سو سو بستروں کے پچھتر آراستہ ہسپتالوں یا ایک ایک ہزار طلبہ پر مشتمل تیس سائنسی تدریسی شعبوں کی لاگت کے برابر ہے

فوٹو: اے پی این، ایوانوف

کر دی جاتی تھیں اور اسی قسم کے دوسرے قدم بھی اٹھائے جاتے تھے۔ تلخ تجربے نے ہمیں سکھایا ہے کہ نئی جنگوں اور فتوحات کو روکنے کے بجائے اس سے جنگ کا خطرہ زیادہ بڑھ گیا۔

یہی وجہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں بے انتہا بربادی اور لاکھوں جانوں کے ضیاع نے ہر جگہ لوگوں کو اس بات سے بڑی شدت سے آگاہ کیا کہ عالمی امن کی ضرورت فوری نوعیت کی حامل ہے اور اس کو برقرار رکھنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ تخفیف اسلحہ پر عمل کیا جائے بلکہ جنگ کے حقیقی خاتمے سے پہلے ہی ماسکو، لندن، واشنگٹن اور پیرس مستقبل کے امن کے لیے راستے تلاش کرنے میں مصروف تھے۔

اکتوبر ۱۹۴۳ء میں چار اتحادی طاقتوں کے وزرائے خارجہ کا ایک اجلاس ماسکو میں ہوا۔ ان کے مشترکہ دستخطوں سے شائع شدہ اعلان میں اس بات پر زور دیا گیا کہ بڑی طاقتوں نے نازی دشمن اتحاد میں جس جذبے کا مظاہرہ کیا ہے اسی روحِ اتحاد کے ساتھ تخفیفِ اسلحہ کا مسئلہ حل کرنا چاہیے۔

اُس وقت تخفیفِ اسلحہ کو جس انداز میں زیرِ غور لایا گیا وہ غالباً کسی قدر بھولپن پر مبنی تھا کہ فتح کے بعد سپاہی گھروں کو لوٹیں گے، رائفل اور وردیاں ہمیشہ کے لیے ترک کر دیں گے اور اس کے ساتھ ہی توپوں، ٹینکوں اور بم باروں کی تیاری بند ہو جائے گی۔

بڑی طاقتوں میں سے ایک کے ہاتھوں ہتھیار کی ایک نئی قسم کی آمد اور تیاری نے صورتِ حال بدل ڈالی۔ تخفیفِ اسلحہ کی اہمیت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی، لیکن مسئلے کا حل پہلے سے زیادہ مشکل بن گیا۔

۱۹۴۶ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے پہلے اجلاس میں سوویت یونین نے "ایک ایسے بین الاقوامی کنونشن کا مسودہ تجویز کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اجتماعی بربادی کے مقصد سے ایٹمی قوّت کے استعمال پر مبنی ہتھیاروں کی تیاری اور استعمال کو ممنوع قرار دیا جائے۔" اس میں مطالبہ کیا گیا کہ تین مہینے کے اندر اندر تمام ایٹمی ہتھیار برباد کر دیے جائیں اور یہ بھی جسے آج کل اکثر فراموش کر دیا جاتا ہے کہ وسیع اختیارات کا مالک ایک بین الاقوامی کنٹرول ادارہ قائم کیا جائے۔ اس ادارے کو تمام ملکوں کی ایٹمی تنصیبات تک رسائی ہو اور یہ اس بات کا تعین کرے کہ کوئی مملکت کنونشن کی خلاف ورزی نہیں کر رہی۔

اگر یہ منصوبہ منظور ہو جاتا تو امریکا کے زیرِ تحویل ایٹم بم برباد ہو جاتے اور پھر سوویت یونین

برطانیہ عظمیٰ، فرانس، بلکہ کوئی بھی قوم اس قابل نہیں رہتی کہ اپنے لیے ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم بنائے تخفیفِ اسلحہ کا مسئلہ ایٹمی طاقت کی ایجاد سے پہلے کی حالت پر آجاتا اور شاید اسے حل کرنا آسان ہوتا۔

بہرکیف اُس وقت یہ دلیل دی گئی تھی کہ سوویت یونین اُن ہتھیاروں کی بربادی کا مطالبہ کرتا ہے جو اُس کے پاس نہیں ہیں اور اس طرح وہ فوجی اور عسکری فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اُس وقت کے رائج تصوّرات کے پیشِ نظر اس طرزِ عمل کے لیے وجہِ جواز موجود تھا، لیکن اگر ۱۹۴۱ء میں بیس سال بعد کی صورتِ حال کا اندازہ کیا جاسکتا تو یہ دلیل اپنی پوری قوّت کھو بیٹھتی اور یہ سیاسی طور پر تنگ نظری پر مبنی نظر آتی۔

سائنسی اور فنّی ترقّی اپنے ہی قوانین کی تابع ہے اور یہ قوانین اکثر سیاست سے آزاد ہوتے ہیں۔ اُن دنوں میں بھی جب لیونارڈو ڈاونسی اپنی اُڑن مشین کا نقشہ بنا رہا تھا لوگ موہوم سے انداز میں راکٹوں اور آواز سے تیز رفتار طیّاروں کے امکانات سوچ رہے تھے۔ آج ہر شخص جن عظیم ایٹمی ماہرین طبیعیات اور ماہرینِ ریاضیات کے ناموں سے آگاہ ہے، اگر وہ کبھی پیدا نہ ہوتے تو بھی بلاشبہ دوسرے سائنس داں ایٹمی قوّت اور بربادی اور امن کے لیے اس کی بے پناہ صلاحیتیں جلد ہی دریافت کرلیتے، اس لیے ظاہر ہے کہ دوسرے ممالک تک ایٹمی قوت اور ہتھیاروں کی رسائی محض وقت کی بات تھی۔

تخفیفِ اسلحہ پر جتنے مذاکرات ہوئے اُن میں یقیناً سب سے بڑی رکاوٹ یہی مسئلہ رہا ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کو کس طرح کنٹرول کیا جائے۔ ایک وہ وقت بھی تھا جب اس سوال پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں کہ "کون سی چیز پہلے آئی۔ مُرغی یا انڈا ؟" اپنے موجودہ دَور میں ہم نے اس مسئلے پر نا ختتم مباحث سُنے کہ کنٹرول تخفیفِ اسلحہ سے پہلے ہو یا تخفیفِ اسلحہ کنٹرول سے پہلے۔ بہرحال یہ بات تو ظاہر ہے کہ عقلی فارمولا یہی ہونا چاہیے: "کنٹرول کے بغیر کوئی تخفیفِ اسلحہ ممکن نہیں اور تخفیفِ اسلحہ کے بغیر کوئی کنٹرول ممکن نہیں"۔ اصولی طور پر سب کو اس سے اتفاق ہے، امریکا میں بھی اور سوویت یونین میں بھی، لیکن عمل کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

عملاً جنگ اور بربادی کے وسائل نہ صرف ذخیرہ ہو رہے ہیں بلکہ تکمیل بھی پا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بات پہلے سے زیادہ اہم ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں دیانت کو آسان بنانے کے لیے ہر ممکن سعی کی جائے اور ہتھیار سازی کی دوڑ کو محدود کرکے آخرکار ہتھیاروں

کی مکمل مناہی کے لیے زمین ہموار کی جائے۔

اس سمت میں پہلی کام یاب کوششیں ۱۹۶۳ء میں ہوئیں جب معاہدۂ ماسکو پر دستخط کرنے والی طاقتوں نے فضا میں، خلا میں اور زیرِ آب ایٹمی ہتھیاروں کی آزمائش کے امتناع پر اتفاق کیا۔ یہ اتفاقِ رائے بات چیت کے اُس مکمّل سلسلے کے بعد ہوا جو کنٹرول کے بڑے مسئلے پر مرتکز تھا۔

آج معاہدے کی تکمیل کے چار سال[1] بعد ثابت ہو گیا ہے کہ شکّی اور سنکی لوگ غلطی پر تھے۔ جاسوسی کے قوی آلات نے دو طرف کنٹرول کو یقینی بنانے کے لیے اپنے آپ کو مکمّل طور پر مؤثر ظاہر کر دیا ہے۔

۱۹ دسمبر ۱۹۶۶ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اُس تاریخی معاہدے کو اتفاقِ رائے سے منظور کیا جس میں اُن اُصولوں کا ذکر ہے جو چاند اور دوسرے اجرامِ فلکی سمیت خلا کے استعمال اور دریافت کے سلسلے میں مملکتوں کی سرگرمیوں کے نگراں ہیں۔

یہ معاہدہ خلا میں ایسے آلات کی گردش واضح طور پر ممنوع قرار دیتا ہے جو ایٹمی اسلحہ یا عام بربادی کے ہتھیاروں کی دوسری اقسام کے حامل ہوں۔ اس" خلا کو غیر فوجی علاقہ" قرار دینے والے معاہدے پر، ۲۷ جنوری ۱۹۶۷ء کو لندن، ماسکو اور واشنگٹن بیک وقت دستخط ہوئے۔

بہر حال ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس سے بہت پہلے ۱۹۵۹ء میں معاہدہ انٹارکٹک (جس پر جنوبی برِّ اعظم میں کارفرما بارہ ممالک نے دستخط کیے) نے ضمانت دی کہ قطب جنوبی کا علاقہ "ہمیشہ کے لیے صرف پُر امن مقاصد کے لیے استعمال ہوتا رہے گا اور بین الاقوامی اختلاف کا منظر یا ہدف نہیں بنے گا۔" معاہدہ ان باتوں کی مناہی کرتا ہے کہ اس علاقے میں فوجی اڈّے بنائے جائیں، فوجی نقل و حرکت کی جائے، کسی قسم کے ہتھیاروں کی آزمائش کی جائے، ایٹمی دھماکے کیے جائیں یا یہاں ایٹمی فضلے کو ٹھکانے لگایا جائے۔ قطبِ جنوبی کے علاقے کو غیر فوجی قرار دینے سے اس بات کا تعیّن ہو گیا ہے کہ وہاں جو سائنسی اڈّے قائم ہیں یا جو سائنسی مہمیں چل رہی ہیں، اُن کے درمیان مستقل دوستانہ تعاون جاری رہے گا۔

---

[1] یہ مضمون ۱۹۶۳ء کے معاہدے کے چار سال بعد لکھا گیا تھا۔ (ترجمہ)

یہ اقدامات بعض لوگوں کو کتنے ہی محدود کیوں نہ نظر آئیں، میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ہمیں رجائیت کی وجہ فراہم کرتے ہیں اور اس سمت میں مزید اقدامات کے لیے ایک محرّک کا کام دیتے ہیں۔ بس اب وقت آگیا ہے کہ ایک عالمی کانفرنس میں ایٹمی ہتھیاروں کی مالک ہر قوم عہد کرے کہ وہ ایسے ہتھیاروں کے استعمال میں پہل نہیں کرے گی۔ پھر قطبِ جنوبی کے علاوہ دنیا کے بہت سے حصے ایسے ہیں جنھیں غیر ایٹمی علاقے بنایا جاسکتا ہے اسکینڈے نیویا، بلقان، افریقہ، وسطی یورپ اور بعض دوسرے رقبوں کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک بنانے کے منصوبے پہلے ہی پیش ہو چکے ہیں۔

سوویت یونین کی ایک تجویز سمیت ایسی مختلف تجاویز پیش ہو چکی ہیں کہ تمام فوجی بجٹوں میں دس سے پندرہ فی صد تک یا کسی اور متفقہ تناسب سے کمی کر دی جائے۔ اگرچہ جنوب مشرقی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے واقعات نے ایسے منصوبوں پر عمل درآمد کو نہایت مشکل بنا دیا ہے۔

بہر کیف زیرِ زمین ایٹمی دھماکوں پر پابندی کا مسئلہ اب حل ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ دو سال پہلے، جینوا میں اٹھارہ قوموں کی تخفیفِ اسلحہ کی بات چیت کے موقع پر بہت سے غیر وابستہ ممالک نے ایک مصالحتی منصوبہ پیش کیا تھا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ بڑی طاقت کے زیرِ زمین دھماکے ممنوع قرار دیے جائیں اور جب تک اس مسئلے پر کوئی عام سمجھوتا نہیں ہوتا، دوسرے تمام زیرِ زمین دھماکوں کو عارضی طور پر بند کر دیا جائے۔ یہ تجویز سوویت موقف سے پوری مطابقت نہیں رکھتی، لیکن سوویت یونین نے محض اس لیے اسے مفید اثرات کی وجہ سے قبول کر لیا ہے کہ اس سے تبادلِ خیال پھر شروع ہو سکتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۶۵ء کے "یونیسکو کوریئر" میں والٹر لپ مین کا وہ مقالہ میں نے بڑی دل چسپی سے پڑھا جس میں مستقل بنیاد پر قیامِ امن کے راستوں کی تلاش پر اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔ جناب لپ مین نے اپنے مضمون میں جو منطق اور انداز اختیار کیے اور اُن سے جو احساسات ابھرتے ہیں میں انھیں پسند کرتا ہوں، لیکن ممتاز امریکی صحافی کے ایک نکتے سے میں اتفاق نہیں کر سکتا۔

جناب لپ مین رقم طراز ہیں، "۔۔۔ ایٹمی طاقتوں کے درمیان جنگ اب اُن کی قومی حکمتِ عملی کا ذریعہ نہیں رہ سکتی۔ اور جیسا کہ خاصا اغلب ہے اگر مملکتوں کی ایک خاصی تعداد

۵ اگست ۱۹۶۳ء کو ماسکو میں ایٹمی تجربات کو ممنوع قرار دینے کے جس معاہدے پر دستخط ہوئے اس کی رُو سے فضا میں، خلا میں اور زیرِ آب ایٹمی ہتھیاروں کی آزمائش بند کر دی گئی۔ فرانس اور عوامی جمہوریۂ چین نے دستخط نہیں کیے تھے اور اُنھوں نے فضا میں ایٹمی تجربات کیے ہیں۔

بالائی تصویر:۔ سائنس داں ایک ایسا ریڈیو گرام دیکھ رہا ہے۔ جو فضا میں تاب کاری سے آلودگی کا انکشاف کرتا ہے۔ تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاہدۂ ماسکو کے بعد ایٹمی گرد سے آلودگی خاصی کم ہو گئی ہے۔

اوپر بائیں جانب کی تصویر:۔ ۱۹۶۲ء کے موسمِ خزاں کا ریڈیو گرام ہوا میں تابکار ذرات کی گنجانی ظاہر کرتا ہے۔

اوپر دائیں جانب کی تصویر:۔ ۱۹۶۵ء کے ریڈیو گرام میں فقط چار نشانات ہیں جنھیں دائرے کے اندر دکھایا گیا ہے۔

بشکریہ "سوویت یونین"

ایٹمی ہتھیار حاصل کرے تو بھی صورت وہی رہے گی جو میں بیان کر چکا ہوں۔ کوئی قوم کسی جگہ بھی ایسے ہتھیاروں کے استعمال کا خطرہ مول نہیں لے سکتی، کیوں کہ ان کی وجہ سے وہ خود خوفناک انتقام کا شکار بن سکتی ہے۔ اس لیے یہ امکان مناسب حد تک موجود ہے کہ باہمی تسدید سے عظیم جنگ کو ٹال دیا جائے۔"

بدقسمتی سے فوجی کش مکشوں کے اپنے قانون ہوتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں وہ عقلِ سلیم کے قوانین کی اطاعت نہیں کرتے۔ مشرقِ وسطیٰ کے خطے میں جو واقعات ہو رہے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ مملکتوں یا مملکتوں کے گروہوں کے درمیان مسلح تصادم نہ ناممکن ہیں اور نہ کبھی کم ہونے والے ہیں۔ کیا ہم اس بات پر یقین کر سکتے ہیں کہ اگر ایٹمی ہتھیاروں کی مالک چھوٹی قوموں میں مسلح کش مکش ہو تو یہ مانع عنصر صحیح ثابت ہوگا کہ مسلح رہنے سے امن کی ضمانت ملتی ہے اور یہ قومیں اپنے اسلحہ خانے کا ہر ہتھیار استعمال نہیں کریں گی؟

میں تو ایک اور امریکی صحافی جان گنتھر سے اتفاق کا رجحان رکھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ اگر ایٹمی ہتھیار سب ملکوں کے پاس آ گئے تو سب سے چھوٹا ملک بھی کسی وقت ایک عالمی جنگ کے شعلے بھڑکا سکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ایک ایسا چھوٹا ملک بھی بہت جلد ایٹمی ہتھیار بنانے کے قابل ہو جائے گا جس کی فی کس آمدنی امریکا کی فی کس آمدنی کے بائیسویں سے پچیسویں حصے کے برابر ہے۔ اس وقت دس سے پندرہ ملکوں کے پاس پُرامن مقاصد کی خاطر ایٹمی ری ایکٹر موجود ہیں، لیکن تکنیکی ترقی اور سائنسی معلومات کی نشر و اشاعت کا یہ عالم ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کی لاگت میں کمی کے نتیجے میں صرف دس سے پندرہ تک ہی نہیں بلکہ پچاس یا اس سے بھی زیادہ ممالک زبردست بربادی کے ان ہتھیاروں کے منصوبے بنانے کے قابل ہو جائیں گے۔

ان وجوہ کے پیشِ نظر میرے نزدیک یہ امر خاص طور پر فوری اہمیت کا حامل ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی روک تھام کا معاہدہ[1] ہو جائے۔ بہت سے لوگ اس مسئلے کی حمایت اور مخالفت کے دلائل سے آگاہ ہیں۔ ان کا اظہار جینوا میں تخفیف اسلحہ

---

[1] یہ معاہدہ ہو چکا ہے (ترجمہ)

کے جلسوں، سفارتی حلقوں اور عالمی صحافت میں بار بار ہوتا رہا ہے ۔ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی روک تھام بذاتِ خود آخری مقصد نہیں بلکہ اس جانب پہلا ضروری قدم ہے کہ ان ہتھیاروں کو ممنوع قرار دیا جائے اور دنیا میں ہر جگہ اس کے ذخیرے برباد کر دیے جائیں۔ مزید برآں اگر ایسا معاہدہ ایک حقیقت بن جاتا ہے تو یہ تجویز بھی ہے کہ غیر ایٹمی طاقتوں کو کسی ایٹمی طاقت کے ممکنہ ایٹمی حملے کے خلاف مکمل ضمانت دی جائے ۔

پھیلاؤ کی روک تھام کے خلاف ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کی مناہی اور اس کے نفاذ کے لیے ضروری کنٹرول کا معاہدہ ملکوں کی تکنیکی ترقی میں رکاوٹ ڈالے گا، کیوں کہ اُن کو پُرامن مقاصد کے لیے بھی ایٹمی طاقت کے استعمال سے روکا جائے گا۔ بہر حال یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ کنٹرول کی ایسی صورتیں وضع کی جائیں جن سے کسی قوم کی صنعتی ترقی متاثر نہ ہو ۔ مزید برآں جب اسلحہ سازی میں ایٹمی طاقت کے استعمال کا امکان ختم ہو جائے گا تو ایٹمی قوت کے پُرامن مقاصد کے لیے علم اور تحقیق کی یک جائی میں اضافہ ہو جائے گا ۔

جو اسباب قوموں کو اپنے اسلحہ خانوں میں ہتھیار رکھنے پر مجبور کرتے ہیں انھیں سمجھنا آسان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھیں پسند کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا، لیکن اس مَد میں جو روپیا صرف ہوتا ہے، وہ بہت پریشان کُن ہے ۔ ۱۹۶۴ء میں دنیا نے صرف ہتھیاروں پر ایک لاکھ بیس ہزار ملیون ڈالر (بارہ کھرب روپے) کی عظیم رقم جھونک دی۔ آج یہ رقم بہت بڑھ چکی ہے۔ اگر کسی اور شمسی نظام کا کوئی خیالی باشندہ ہمارے سیّارے میں آئے تو بے شک وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہوگا کہ ہم زمین کے رہنے والے کیوں اپنے وسائل اور قوتیں اس قدر فضول ضائع کرتے ہیں ۔

ویت نام اور مشرقِ وسطیٰ کی مثالوں سے یہ کافی حد تک واضح ہو چکا ہے کہ آج کے دن اور آج کے زمانے میں کوئی مسئلہ جنگ کے ذریعہ سے حل نہیں ہو سکتا، اور ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے یہ بات اور بھی ناممکن ہو جاتی ہے۔ پس آج اسلحہ بندی اور اس کی برباد کن نوعیت ہمارے زمانے کا انتہائی تکلیف دہ مسئلہ ہے۔

۱۹۶۷ء میں سوویت یونین نے ۱۴ ہزار ۵ سو ملیون روبل (میزانیہ کا ۱۳ اعشاریہ ۲ فی صد) دفاع پر صرف کیے۔[1] ظاہر ہے یہی رقم سوویت یونین میں بہت سے مفید کاموں پر صرف کی جا

---

[1] سوویت یونین اپنے دفاع بجٹ میں تحقیقی اور ترقیاتی لاگت شامل نہیں کرتا، ۱۹۶۶ء کے لیے کل حقیقی دفاعی خرچ ۳۵ ہزار ملیون ڈالر سے زیادہ رہا ۔

سکتی تھی۔ امریکا اسلحہ پر اس سے بھی بڑی رقوم صرف کرتا ہے اور اُسے بھی بہت سے معاشرتی مسائل کو حل کرنا ہے۔ مثلاً تعلیم میں رکاوٹیں، صحتِ عامّہ اور سائنس، اور جو رقوم اس وقت اسلحہ پر صرف ہوتی ہیں وہی ان مفید کاموں پر صرف ہو سکتی تھیں۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اسلحہ پر اخراجات موجودہ سطح پر رہیں گے (اگرچہ کوئی بھی ایسا نہیں چاہتا تو بھی سوویت یونین آنے والے بیس سالوں میں ۲ لاکھ تیس ہزار ملیون روبل صرف کرے گا۔ اگر اسلحہ بندی کی عمومی اور مکمّل بندش ایک حقیقت بن جائے اور فرض کیجیے کہ تخفیفِ اسلحہ سے بچائی ہوئی رقم کا بیس فی صد ترقی پذیر ممالک کے لیے وقف کر دیا جائے تو پھر بھی سوویت یونین کے پاس مفید مقاصد کے لیے ۲ لاکھ تیس ہزار ملیون روبل کی رقم بچ رہے گی۔ یہ رقم بہت سے مقاصد پر صرف ہو سکے گی مثلاً سوویت عوام کے معیارِ زندگی میں بہتری، سائبیریا میں بڑے پیمانے پر ترقیاتی منصوبوں کا اجرا، صحرائی اراضی میں آب پاشی وغیرہ...

اگر عالمی ترقیاتی نقشے پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ پورے کے پورے برِّ اعظم وسائل اور امداد کے محتاج ہیں تاکہ اُن میں ترقیاتی عمل مکمل ہو۔ صرف ایک مثال کافی ہے۔ اگر دنیا کے آبی وسائل کو کام میں لایا جا سکے تو ہمارے سیارے کے وسیع علاقوں کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے مثلاً ایشیا میں دریائے سندھ اور دریائے میکانگ، دجلہ، فرات، افریقہ میں نیل اور اس کے معاون دریا اور دریائے کانگو اور لاطینی امریکا میں دریائے پرانا اور دریائے ایمیزن۔

نوعِ انسانی اب اُن عظیم دولتوں اور امکانات سے آگاہ ہو رہی ہے جو اُس کے سامنے ہیں۔ اگر انھیں موثر طور پر بروئے کار لایا جائے تو بھوک اور بیماری کے اور زندگی کے پست معیاروں سے اُبھرنے والے دوسرے مسائل ختم ہو سکتے ہیں، مثلاً ناخواندگی جو اب بھی ترقی پذیر ممالک کے کروڑوں باشندوں کو متاثر کر رہی ہے۔ اگر نوعِ انسانی اپنی قوّت اور ذہانت کا عقل و فراست کے ساتھ استعمال کرے تو وہ کہیں زیادہ تیز رفتاری سے اپنی تقدیر کی تکمیل کا سامان فراہم کر سکتی ہے... بلکہ آفاقی پیمانے پر بھی، کیوں کہ اب انسان ارضی کشش کی حدود سے ماورا سرگرمِ کار ہے۔

پرانے زمانوں میں لوگ "دورِ زرّیں" کے خواب دیکھا کرتے تھے، لیکن افلاطون یا ٹامس مور کے زمانے میں یہ محض ایک خیال و تصوّر تھا، مسرت کا محض ایک خواب۔ آج برقی مشینوں

کی مدد سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر عمومی امن اور اسلحہ بندی کے مکمل خاتمے کا دور آ جائے تو انسانی وجود کے مختلف شعبوں میں کتنی زبردست ترقی ہو سکتی ہے۔

تیسرا حصّہ

ترقی امن ہے

باب سوم - الف

ہز ہولی نس پوپ پال ششم کا گشتی مکتوب[1]

ترقی - امن کے لیے نیا نام

فلاکت سے آزادی، روزی پانے کا بہتر تیقن، صحت اور مقررہ روزگار؛ کسی قسم کے ظلم کے بغیر انسانی وقار کو دھچکا دینے والی صورتوں میں تحفظ کے ساتھ ذمّے داری میں پہلے سے زیادہ حصّہ؛ بہتر تعلیم؛ مختصر یہ کہ زیادہ کام کرنے، زیادہ جاننے، زیادہ حاصل کرنے کی سعی اور زیادہ بھرپور شخصیت کا حصول ـــــ یہی وہ آرزوئیں ہیں جو انسانوں کے دلوں میں مچلتی ہیں، بالخصوص آج کے حالات میں، جب کہ انسانوں کی زیادہ تعداد ایسے حالات میں رہنے پر مجبور ہے جو قانونی طور پر ان کی صحیح خواہش کو بھی سراب بنا دیتے ہیں۔

مزید برآں جن قوموں نے حال ہی میں قومی آزادی حاصل کی ہے، وہ چاہتی ہیں کہ سیاسی آزادی کے پہلو بہ پہلو معاشرتی اور معاشی طور پر آزادانہ نشو و ارتقا پائیں، تاکہ وہ اپنے شہریوں کو احساس دلائیں کہ انھیں بھرپور انسانی ترقی مل سکتی ہے اور وہ دوسری قوموں کی صف میں اپنا صحیح مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

---

[1] ۲۶ مارچ ۱۹۶۷ء کو تقدس مآب پوپ پال ششم نے عوام کی ترقی کے بارے میں ایک دُور رس گشتی مراسلہ جاری کیا، جس میں بھلائی کے خواہاں تمام لوگوں سے کہا گیا تھا کہ وہ دنیا کو موجودہ افلاس اور بے انصافیوں سے آزاد کرانے میں تعاون کریں۔ انھوں نے کہا کہ "ترقی امن کا نیا نام ہے"۔ ان کے گشتی مراسلے کے خاص خاص حصے اس مضمون کا متن ہیں۔

نوآبادیات اور نوآبادیاتی نظام

ماضی سے ورثے میں جو وسائل ملے ہیں اگرچہ وہ کام کی وسعت اور فوری اہمیت کے لیے ناکافی ہیں، لیکن اس بات کو یقیناً تسلیم کرنا چاہیے کہ نوآبادیاتی طاقتوں نے اکثر اپنے مفادات کو آگے بڑھایا، اپنی طاقت اور شان بڑھالی اور یہ کہ اُن کی روانگی کے بعد بعض اوقات ایک پُرخطر معیشت رہ گئی، جو مثال کے طور پر فصل کی ایک ہی قسم کی پیداوار سے بندھی تھی اور منڈی میں اُس کے بھاؤ اچانک اور خاصی بڑی حد تک گرنے کے تابع تھے۔

ایک خاص قسم کی سامراجیت اور اس کے نتائج سے پہنچے ہوئے نقصان کو تسلیم کرنے کے باوجود اُن آبادکاروں کی خوبیوں اور کارناموں کو بھی ماننا چاہیے جو اپنے ساتھ اپنی سائنس اور تکنیکی علم لائے اور بہت سے پس ماندہ علاقوں میں اپنے وجود کی بدولت مفید نتائج بھی چھوڑ گئے۔

انھوں نے جو ڈھانچا کھڑا کیا وہ کتنا ہی نامکمّل کیوں نہ ہو، بہر حال موجود ہے۔ انھوں نے جہالت اور بیماری میں کمی کی۔ وہ مواصلات کے فوائد لائے اور رہن سہن کے حالات کو بہتر بنایا۔

بڑھتا ہوا عدم توازن

اسے تسلیم کرنے کے باوجود یہ بات ظاہر ہے کہ نتیجے میں جو صورتِ حال اُبھری وہ جدید معاشیات کی سخت حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے واضح طور پر ناکافی ہے۔ اگر اسے اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو اس سے دنیا میں زندگی کی سطح کے فرق کم نہیں ہوتے بلکہ بڑھتے ہیں۔ امیر قومیں تیزی سے نشوونما پاتی ہیں اور غریب آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہیں۔ عدم توازن بڑھتا چلا جا رہا ہے بعض ممالک ضرورت سے زیادہ اناج پیدا کرتے ہیں جب کہ دوسرے سختی کے ساتھ اس کی کمی کا شکار ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اُن کی برآمدات غیر یقینی ہیں۔

ناجائز تکلیف

اس کے ساتھ ہی معاشرتی کش مکش نے عالم گیر وسعت حاصل کر لی ہے۔ صنعتیائے جانے والے ملکوں کے غریب طبقات میں جو پیچیدہ اضطراب موجود ہے، اُس نے اُن ملکوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے جن کی معیشت قریب قریب زرعی ہے کھیتوں میں کام کرنے والے بھی اپنی ''ناجائز تکلیف'' سے آگاہ ہو رہے ہیں۔

پھر یہ اسکینڈل بھی ہے کہ صرف املاک سے تلذذ ہی میں واضح عدم مساوات نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ اقتدار کے استعمال میں ناہمواریاں موجود ہیں بعض خطوں میں جہاں ایک مختصر، محدود گروہ ایک عمدہ تہذیب سے لطف اُٹھا رہا ہے، وہیں باقی غریب اور منتشر آبادی ذاتی پیش قدمی اور ذمّہ داری کے قریب قریب تمام امکانات سے محروم ہے اور اکثر اوقات اس کے رہن سہن اور کام کے حالات انسانی حیثیت سے ادنا ہیں۔

تہذیبوں کی کش مکش مزید برآں روایتی تہذیبوں اور صنعتی تہذیب کے نئے عناصر کے درمیان کش مکش سے وہ ڈھانچے ٹوٹ جاتے ہیں جو اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق نہیں بنالیتے۔ اُن کا اندازِ زندگی جو بعض اوقات سخت گیر بھی ہوتا ہے، ذاتی اور خاندانی زندگی کے لیے ایک ضروری سہارا تھا۔ زیادہ عمر کے لوگ اس سے وابستہ رہتے ہیں۔ نوجوان فرار حاصل کرتے ہیں۔ اُسی طرح جیسے کوئی لاحاصل رکاوٹوں سے دور جاتا ہے اور معاشرے میں زندگی کی نئی صورتوں کی طرف اشتیاق سے بڑھتا ہے۔

نسلوں کی کش مکش اس المناک مسئلے سے زیادہ سنگین ہوجاتی ہے کہ آیا آباد اجداد کے اداروں اور عقیدوں کو برقرار رکھا جائے اور ترقّی سے انکار کیا جائے یا باہر سے نئی تکنیک اور نئی تہذیبوں کو داخل ہونے دیا جائے اور ماضی کی روایات کے ساتھ ساتھ اُن کے پورے انسانی شرف کو بھی مسترد کردیا جائے۔ درحقیقت ماضی کے اخلاقی، روحانی اور مذہبی سہاروں کو اکثر اوقات نئی دُنیا میں ایک مقام کی ضمانت حاصل کیے بغیر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

خطرناک انتشار اس انتشار میں ایسے نجات دہندہ قسم کے نظام کی تلاش میں نکلنے کا لالچ زیادہ ہوجاتا ہے جو دعدے تو بہت سے کرتا ہے لیکن اگر تخلیق کرتا ہے تو محض دھوکا اور فریب دیتا ہے۔ اس سے جو نتائج اُبھرتے ہیں وہ جانے پہچانے ہیں: متشدّد عوامی ردّعمل، بغاوت کے لیے ایجی ٹیشن اور آمرانہ نظریات کی طرف رجحان۔ یہی امور مسئلے کا مواد ہیں اور اس مسئلے کی سنگینی سب پر ثابت ہے۔

معاشی نشو ونما کافی نہیں ترقّی کو محض معاشی نشو ونما میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ اسے قابلِ اعتماد بنانے کے لیے ضروری ہے کہ یہ مکمّل ہو، صحیح و سالم ہو، یعنی اِسے ہر شخص کی بھلائی اور پورے انسان کی بھلائی کو آگے بڑھانا ہے۔

ایک عالمی ذمّے داری لیکن ہر شخص معاشرے کا رُکن ہے وہ پوری نوعِ انسانی کا جُزو ہے۔

یہ صرف چند افراد کا معاملہ نہیں، سب کا معاملہ ہے۔ سب کو بھرپور ترقی سے لطف اندوز ہونا ہے۔ تہذیبیں پیدا ہوتی ہیں۔ پھلتی پھولتی ہیں اور مرجاتی ہیں، لیکن انسانیت تاریخ کے راستے پر گامزن رہتی ہے۔ ایک اُٹھتے ہوئے طوفان کی لہروں کی طرح جو آہستہ آہستہ ساحل پر تجاوز کرتی ہیں۔ ہم نے چوں کہ ماضی کی نسلوں سے کچھ حاصل کیا اور اپنے ہم عصروں کے کام سے استفادہ کیا، اس لیے ہم سب کے احسان مند ہیں اور ہم ان لوگوں میں دل چسپی لینے سے انکار نہیں کرسکتے جو انسانی خاندان کو وسعت دینے کے لیے ہمارے بعد آئیں گے۔۔۔۔

نشو و نما کا تضاد

تمام نشو و نما تضاد کا حامل ہے۔ اگر انسان کو انسان کی حیثیت سے پھلنا پھولنا ہے تو یہ ضروری ہے، لیکن اگر انسان اِس کو سب سے اچھا سمجھ لے تو ایک لحاظ سے وہ قید ہوجاتا ہے اور اس سے اُس کا نقطۂ نگاہ محدود ہو جاتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ دل سخت ہوجاتے ہیں اور دماغ بند۔ انسان دوستی کے لیے اکٹھے نہیں ہوتے بلکہ محض خود غرضی کی خاطر اور یہ طرزِ عمل جلد ہی مخالفتوں اور نااتفاقیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ پس مال و متاع کا بلا شرکتِ غیرے تعاقب فرد کی تکمیل اور اصل عظمت کے راستے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ قومیں ہوں یا افراد لالچ اخلاقی پس ماندگی کی واضح ترین شہادت ہے۔

بہبود کے بہتر معیار کی جانب

اگر مزید ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تکنیکی ماہرین کام کریں تو اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ دانش مند لوگ ایک ایسی نئی انسان دوستی کی تلاش میں گہری سوچ بچار سے کام لیں جو جدید انسان کو اس قابل بنائے کہ وہ محبت اور دوستی، عبادت اور تفکّر کی اعلا قدروں کو اپنا کر اپنے آپ کو نئے سرے سے دریافت کرے۔ اسی سے بھرپور حقیقی ترقی وجود میں آئے گی۔ ایسی ترقی، جو سب کے لیے فلاح و بہبود کے کم تر معیار سے بہتر معیار تک پہنچنے کا ذریعہ بنے گی۔

مطلوبہ نصب العین

قابلِ اصلاح حالات: وہ لوگ جو لوازمِ حیات کی انتہائی کم مقدار سے بھی محروم ہیں، ان میں مالی ضروریات کی کمی، جو خود غرضی کا شکار ہوچکے ہیں، ان کی اخلاقی کم زوریاں، ظالمانہ معاشی نظام خواہ ان میں ملکیت کے غلط استعمال یا طاقت کے غلط استعمال سے کارکنوں کا استعمال ہوتا ہو یا غیر منصفانہ لین دین ہو۔ بہبود کا بہتر معیار:

بے سروسامانی کی حالت سے نکل کر حصول ضروریات تک رسائی، معاشرتی ظلم وستم پر فتح، اضافۂ علم اور حصول ثقافت۔ **مزید بہبود:** دوسروں کے وقار کا اور زیادہ احترام، افلاس کی رُوح پر غور، مشترکہ بھلائی کے لیے تعاون، امن کے لیے عزم اور خواہش۔

صنعت کاری معاشی نشوونما اور انسانی ترقی کے لیے صنعت کا نفاذ ایک ضرورت ہے۔ یہ ترقی کی ایک علامت بھی ہے اور اس میں مدد بھی دیتی ہے۔

انسان مسلسل محنت اور ذہانت سے آہستہ آہستہ فطرت سے اُس کے راز چھینتا ہے اور اس کی دولت کو بہتر استعمال میں لاتا ہے۔ جب اُس کے ضبطِ نفس میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ تحقیق اور دریافت کا ذوق حاصل کرتا ہے۔ جچا تلا خطرہ مول لینے کی صلاحیت، مہمات میں جرات؛ اپنے ہر کام میں فراخ دلی اور ذمّے داری کا احساس پیدا کرتا ہے۔

روشن خیال سرمایہ داری لیکن یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ معاشرے کے ان نئے حالات کی بنیادوں پر ایک ایسا نظام تعمیر کیا گیا ہے جو منافع کو معاشی ترقی کا کلیدی محرّک سمجھتا ہے۔ مسابقت کو اعلاترین قانونِ معاشیات قرار دیتا ہے اور پیداواری وسائل کی نجی ملکیت کو ایک ایسا مطلق حق بتاتا ہے جس کی کوئی حدیں نہیں اور جس سے کوئی معاشرتی ذمّے داری وابستہ نہیں۔

یہ بے مہار لبرل ازم آمریت کی طرف رہنمائی کرتا ہے جس کی مذمت میں پلوس یازدہم نے صحیح کہا تھا کہ یہ لبرل ازم" روپے پیسے کا بین الاقوامی سامراج" پیدا کرتا ہے۔ ان خرابیوں کی سخت مذمت کا ایک ہی طریقہ ہے کہ پوری سنجیدگی کے ساتھ ایک بار پھر یہ اُصول پیش کیا جائے کہ معیشت اصلاً انسان کی خدمت کے لیے ہوتی۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ سرمایہ داری کی ایک قسم حد سے زیادہ مصیبت، بے انصافیوں اور اپنوں میں تصادم کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اور جس کے اثرات اب تک موجود ہیں تو یہ بھی غلط ہوگا کہ نظام کی ساری خرابیوں کو صنعت وحرفت کے پھیلاؤ سے منسوب کر دیا جائے۔ اس کے برعکس ہمیں انصاف سے کام لیتے ہوئے یہ تسلیم کرنا ہے کہ ترقی سے جو کچھ حاصل ہوا اس میں مزدوروں اور صنعت کی تنظیموں نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔

کام کی فوری اہمیت ہمیں عجلت سے کام لینا چاہیے۔ بہت سے لوگ دُکھ جھیل

فلاکت سے آزادی، روزی پانے کا بہتر تیقّن، صحت اور مقررہ روزگار، ذمے داری
میں پہلے سے زیادہ حصّہ، انسانی وقار کو دھچکا دینے والی صورتوں سے تحفّظ کے ساتھ
بہتر تعلیم، مختصر یہ کہ زیادہ کام کرنے، زیادہ جاننے، زیادہ حاصل کرنے کی سعی اور

فوٹو ۞ مرئیل واٹیرز

زیادہ بھرپور شخصیت کا حصول ـــ یہی وہ آرزوئیں ہیں جو انسانوں کے دلوں میں مچلتی ہیں...

رہے ہیں اور وہ فاصلہ بڑھ رہا ہے جو بعض لوگوں کی ترقی اور دوسروں کے جمود، بلکہ پسپائی اور تنزل کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے...

تشدد کے لیے کشش ایسی صورتیں یقیناً ہوتی ہیں جب بے انصافی کی فریاد آسمان تک جاتی ہے، جب پوری کی پوری آبادیاں ضرورتوں سے محروم ہوں، محتاجی کی زندگی گزارتی ہوں اور اُن کے لیے کام اور ذمے داری کے دروازے بند ہوں۔ ثقافتی پیش رفت کے مواقع بھی مسدود ہوں اور جو معاشرتی اور سیاسی زندگی میں حصہ نہ لے سکیں تو ایسی صورت میں انسانی وقار کو نقصان پہنچانے والے عناصر کے خلاف تشدد اختیار کرنے کی خواہش بہت پُرکشش ہوتی ہے۔

انقلاب بہرحال ہم جانتے ہیں کہ ایک انقلابی شورش اس جگہ کے سوا جہاں طویل عرصے کے ظلم کی وجہ سے بنیادی ذاتی حقوق کو عظیم نقصان پہنچا ہو اور ملک کے مشترکہ مفاد کو خطرناک صدمہ پہنچا ہو، نئی بے انصافیاں پیدا کرتی ہے۔ زیادہ عناصر کو بے قابو کرتی ہے اور نئی مصیبتیں لاتی ہے۔ ایک حقیقی برائی کے خلاف لڑائی، اس سے بھی بڑی مصیبت کی لاگت پر نہیں لڑنی چاہیے۔

اصلاح ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا مفہوم بالکل واضح ہو۔ آج کی صورتِ حال کا مقابلہ جرأت کے ساتھ کرنا چاہیے اور جو بے انصافیاں اس سے وابستہ ہیں، ان کے خلاف لڑنا چاہیے اور اُن پر قابو پانا چاہیے۔ ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ جرأت آمیز تغیرات عمل میں لائے جائیں اور ایسی جدتیں کی جائیں جن کا اثر گہرا ہو۔ ضروری اصلاحات بغیر تاخیر کے جاری کرنی چاہئیں۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ بڑی دریا دلی کے ساتھ اس میں حصہ لے۔ بالخصوص یہ فرض اُن لوگوں کا ہے جن کی تعلیم، حیثیت اور مواقع انھیں عمل کا وسیع دائرہ مہیا کرتے ہیں۔

انسانی خدمت کے لیے دنیا کو رہنے کے لیے ایک زیادہ انسانی جگہ بنانے کی خاطر صرف یہ کافی نہیں کہ ٹکنالوجی کو آگے بڑھایا جائے جو لوگ ترقی کے راستے پر چل رہے ہیں اگر انھیں اس دائرے میں خطرات سے بچنا ہے تو انھیں اپنے پیش روؤں کی غلطیوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ آنے والی کل کی ٹکنالوجی کا دور ایسی برائیاں پیدا کر سکتا ہے جو گزری ہوئی کل کے لبرل ازم کی برائیوں کے برابر بڑی ہوں۔

معاشیات اور ٹکنالوجی کا کوئی مطلب نہیں رہتا سوائے اس کے کہ یہ انسان کی خدمت

کرے ؛ اور انسان صرف اس صورت میں صحیح معنوں میں انسان ہے کہ خالقِ حقیقی نے اُسے جو فطرت عطا کی اور جس کے امکانات اور تقاضوں کو وہ خود آزادانہ بروئے کار لاتا ہے، اُن کی قدر و قیمت کو خود پہچانتا ہو۔

خواندگی کے حصول کی مساعی اس امر کا حتمی دعوا کیا جا سکتا ہے کہ معاشی نشوونما کا دارو مدار سب سے پہلے معاشرتی ترقی پر ہوتا ہے لہٰذا ترقیات کا کوئی بھی منصوبہ ہو، بنیادی تعلیم اس کا اوّلین مقصد ہوتا ہے۔ سچ پوچھیے تو تعلیم کی بھوک بھی اتنی بُری ہے جتنی غذا کی بھوک۔ ناخواندہ شخص وہ ہے جس کا دماغ کم غذا کا شکار ہے۔ پڑھنے اور لکھنے کی قابلیت اور ایک پیشہ ورانہ تربیت کا مطلب اپنے آپ میں اعتماد کی بحالی ہے اور اس سے انسان میں یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے پہلو بہ پہلو ترقی کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے تہران کی یونیسکو کانگریس منعقدہ ۱۹۶۵ء کے نام اپنے پیغام میں کہا تھا "انسان کے لیے خواندگی معاشرتی تکمیل کا بنیادی عنصر بھی ہے اور ذاتی حیثیت کو جِلا دینے والا بھی۔ یہ معاشرے کے لیے معاشی ترقی اور اس کے پھلنے پھولنے کا ایک اچھا ذریعہ بھی ہے"۔

ہمیں خوشی ہے کہ اس شعبے میں نجی مساعی، سرکاری حکّام اور بین الاقوامی جماعتوں کی بدولت اچھا کام ہوا ہے یہ ترقیاتی عمل کے اوّلین عاملین ہیں کیوں کہ یہ انسان کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو۔۔۔

آبادی کا مسئلہ یہ صحیح ہے کہ آبادی میں تیز رفتار اضافے سے اکثر اوقات ترقیاتی مسائل میں زیادہ الجھاؤ پیدا ہو جاتے ہیں آبادی کی تعداد دست یاب وسائل کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ بڑھ جاتی ہے اور معاملات میں بہ ظاہر ایک جمود سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے کہ جب انقلابی اقدامات کے توسّط سے اضافۂ آبادی کو روکنے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔

یہ یقینی ہے کہ سرکاری حکّام اپنے اختیارات کی حد کے اندر رہتے ہوئے ایسی مداخلت کر سکتے ہیں کہ مناسب معلومات کی فراہمی کو آسان بنائیں اور مناسب قدم اٹھائیں بشرطے کہ وہ اخلاقی قانون کے مطابق ہوں اور شادی شدہ جوڑوں کی جائز آزادی کا احترام کریں۔ جہاں شادی اور تولید کا ناقابلِ انتقال حق موجود نہ ہو، وہاں انسانی وقار ختم ہو جاتا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ معاملے کا پورا علم رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا والدین کا کام ہے کہ اُن

کے کتنے بچے ہوں اور اس سلسلے میں انھیں اپنی اُن ذمّے داریوں کا خیال رکھنا ہوگا جو خدا کی جانب، خود اپنے بارے میں اور پہلے سے پیدا بچوں کے سلسلے میں اور اپنی برادری کے حوالے سے اُن پر عائد ہوتی ہیں۔ اُن تمام معاملات میں انھیں خدائی قانون کی مستند تاویل سے منوّر اپنے ضمیر کی آواز (اور خدا پر بھروسے کی قوّت) سے پر عمل کرنا ہوگا۔

ثقافت کی پیش رفت پیشہ ورانہ جماعتوں کے علاوہ بعض ادارے بھی کام کر رہے ہیں۔ ترقیاتی عمل کی کامیابی میں اُن کا کردار کم اہم نہیں ہے۔ ویٹی کن کونسل سنجیدگی سے اعلان کرتی ہے "اگر دانش مند لوگ سامنے نہ آئے تو دنیا کا مستقبل خطرے میں ہے۔ بہت سی قومیں معاشی مصنوعات کے اعتبار سے غریب تر ہیں، لیکن وہ دانش کی دولت سے مالا مال ہیں اور اس قابل ہیں کہ دوسروں کے لیے قابل توجّہ فوائد مہیا کریں"۔

امیر ہو یا غریب، ہر قوم کی ایک تہذیب ہے جو اُسے اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملی ہے۔ مثلاً اس دنیا میں زندگی کے لیے ادارے، روح کی زندگی کے اعلا مظاہر، نیز فن کارانہ، ذہنی اور مذہبی نوعیت کے مظاہر۔ اگر موخر الذکر کے پاس سچی انسانی قدریں ہوں تو انھیں اوّل الذکر کی خاطر قربان کر دینا سنگین غلطی ہے۔ جو قوم ایسی حرکت کرے گی وہ اپنی میراث کا بہترین حصہ کھو بیٹھے گی۔ زندہ رہنے کی خاطر وہ جینے کے اسباب قربان کرے گی...

اتحاد کی روح انسان کے مکمّل نشو و نما کی جانب کوئی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اتحاد کے جذبے کے ساتھ پوری نوعِ انسانی کی بیک وقت ترقی کا بندوبست نہ ہوگا۔ جیسا کہ ہم نے بمبئی میں کہا تھا "انسان انسان کے ساتھ اور قوم قوم کے ساتھ بھائیوں اور بہنوں کی طرح اور خدا کے بچوں کی طرح ملے۔ اس باہمی مفاہمت اور دوستی اور اس مقدّس رفاقت میں ہم سب کا فرض ہے کہ نسلِ انسانی کا مشترکہ مستقبل تعمیر کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کر دیں"۔ ہم نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ تنظیم اور تعاون کے ٹھوس اور عملی راستوں کی تلاش کی جائے تاکہ تمام دست یاب وسائل ایک جگہ اکٹھے ہوں اور اس طرح تمام قوموں کے درمیان ایک حقیقی رفاقت وجود میں لائی جا سکے۔

قوموں کی برادری یہ فرض خاص طور پر ترقی یافتہ قوموں کا ہے۔ اُن کی ذمّے داریاں ایک ایسی اخوت سے ابھرتی ہیں جو بیک وقت انسانی بھی ہے اور فوق الفطری بھی۔ اس کے تین پہلو ہیں۔ انسانی یک جہتی: وہ مدد، جو امیر قومیں ترقی پذیر قوموں کو فراہم کریں؛

معاشی عدل: طاقت ور قوموں اور کم زور قوموں کے درمیان غیر منصفانہ تجارتی روابط کی درستی؛ عالم گیر انسانی محبت کا فرض: ایک ایسی دنیا کو وجود میں لانے کی سعی جو تمام انسانوں سے بہترین انسانی سلوک روا رکھے، جہاں سب اس قابل ہوں گے کہ کچھ دیں اور کچھ پائیں اور ایسا نہ ہو کہ کوئی ایک گروہ دوسرے گروہ کو نقصان پہنچا کر ترقی کرے۔ یہ مسئلہ فوری اہمیت رکھتا ہے، کیوں کہ اس پر دنیا کی تہذیب کے مستقبل کا انحصار ہے۔

بھوک کے خلاف جنگ

آج کوئی بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ پورے پورے برّاعظموں میں ان گنت مرد اور عورتیں بھوک کی شکار ہیں۔ ان گنت بچّوں کو ضرورت کے مطابق خوراک نہیں ملتی۔ اس لیے ان میں سے بہت سے عالمِ طفولیت میں مر جاتے ہیں۔ بہت سوں کی جسمانی اور دماغی نشوونما میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورے کے پورے خطّے نہایت پریشان کن مایوسی کے شکار ہو جاتے ہیں... بھوک کے خلاف جو مہم خوراک و زراعت کی تنظیم نے شروع کر رکھی ہے اور جس کی حوصلہ افزائی نظامِ پاپائی کر رہا ہے، اس کی حمایت فراخ دلانہ انداز میں کی گئی ہے...

ہر شخص اپنا ضمیر ٹٹولے

لیکن ... یہ محض بھوک کو ختم کرنے یا افلاس کو گھٹانے کا مسئلہ نہیں۔ افلاس کے خلاف جدوجہد فوری اہمیت کی حامل اور ضروری تو ہے، لیکن کافی نہیں۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ ایک ایسی دنیا بنائی جائے جہاں ہر شخص نسل، مذہب اور قومیت کے امتیاز کے بغیر ایک بھرپور انسانی زندگی گزار سکے، جو ایسی غلامی سے آزاد ہو جو دوسرے اُس پر ٹھونسیں۔ جو ایسی فطری قوتوں سے آزاد ہو جن پر اُسے کافی اختیار حاصل نہیں۔ ایک ایسی دنیا، جہاں آزادی کوئی خالی خولی لفظ نہ ہو، اور جہاں غریب آدمی امیر آدمی کے ساتھ ایک ہی میز کے گرد بیٹھ سکے۔ ایسی صورت کا تقاضا یہ ہے کہ امیر انسان عظیم فراخ دلی، بہت سی قربانی اور غیر مختتم سعی سے کام لے۔

ہر شخص اپنے ضمیر کو ٹٹولے، ضمیر جو ہمارے زمانے میں ایک نیا پیغام دیتا ہے۔ کیا وہ اس بات کے لیے تیار ہے کہ مفلس ترین انسانوں کے حق میں سرگرمیوں کی تنظیم کے لیے وہ اپنی جیب سے مدد دے؟ کیا وہ اس لیے زیادہ ٹیکس دینے کو تیار ہے تاکہ سرکاری حکّام ترقّی کے لیے اپنی مساعی کو دوچند کر دیں؟ کیا وہ درآمدی مصنوعات کے لیے زیادہ قیمت ادا کرنے کو تیار ہے تاکہ مصنوعات تیار کرنے والے کو زیادہ منصفانہ معاوضہ حاصل ہو سکے؟ اگر وہ نوجوان ہے تو کیا وہ ضرورت پڑنے

پر وطن چھوڑنے کو تیار ہے تاکہ نئی قوموں کو ترقیاتی عمل میں مدد دے سکے؟

انسانی اتحاد کا فریضہ: اتحاد کا جو فرض افراد پر عائد ہوتا ہے وہی قوموں پر عائد ہوتا ہے۔ "ترقی یافتہ قوموں کی یہ بھاری ذمّے داری ہے کہ وہ ترقی پذیر قوموں کی مدد کریں... ہر قوم کا فرض ہے کہ وہ زیادہ تعداد اور بہتر معیار کی مصنوعات تیار کرے تاکہ وہ اپنے تمام باشندوں کو ایک حقیقی انسانی معیارِ زندگی عطا کر سکے اور نسلِ انسانی کی مشترکہ ترقی میں بھی اپنا حصہ ادا کر سکے۔

پس ماندہ ملکوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیشِ نظر، ایک ترقی یافتہ ملک کے لیے یہ چیز نارمل ہونی چاہیے کہ وہ اپنی پیداوار کا ایک حصّہ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے وقف کرے۔ نیز ایسے اساتذہ، انجینئر، فنی ماہرین اور فضلا کو تربیت دے جو اس بات کے لیے تیار ہوں کہ اپنا علم و ہنر کم خوش نصیب لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں۔

فالتو دولت ہم ایک بار پھر یہ کہتے ہیں کہ متموّل ملکوں کی فالتو دولت غریب قوموں کی خدمت پر صرف کی جائے۔ اب تک جو یہ قاعدہ رائج رہا ہے کہ ہم صرف اپنے قریب ترین لوگوں کی مدد کریں، اب اُسے دنیا کے سارے ضرورت مندوں پر بھی منطبق کرنا چاہیے۔

اس کے نتیجے میں سب سے پہلے امیروں کو فائدہ ہوگا لیکن اگر اُن کا لالچ جاری رہا تو وہ خدا کی نظروں سے گریں گے اور اُن پر غریبوں کا غصّہ بھی نازل ہوگا جو ایسے نتائج کا حامل ہوگا جس کے بارے میں کوئی شخص پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ اگر آج کی پھولتی پھلتی تہذیبیں خود غرضی کی بنا پر اپنے خول میں بند ہیں تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ اُن کی اعلا ترین اقدار خطرے میں پڑ جائیں گی اور وہ محض مزید کے حصول کے لیے عظیم بننے کے عزم کی قربانی دیں گی...

ایک عالمی فنڈ بمبئی میں ہم نے اس بات پر زور دیا کہ اسلحہ پر خرچ ہونے والی رقوم کے ایک حصّے سے ایک بڑا عالمی فنڈ اس مقصد کے لیے قائم کیا جائے جس سے اس دنیا کے مفلس ترین لوگوں کی مدد ہو سکے۔ محتاجی کے خلاف فوری جدوجہد پر لاگو ہونے والا اصول اُس وقت بھی صادق آتا ہے جب "ترقی" کا سوال درپیش ہو۔ صرف عالم گیر تعاون ہی سے بے کار رقابتوں پر قابو پایا جا سکتا ہے اور قوموں کے درمیان ایک مفید اور پُرامن تبادل وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مشترکہ فنڈ اس عالم گیر تعاون کا وسیلہ بھی ہوگا اور علامت بھی۔

بے غرض مدد یقیناً ایسی کوئی ضرورت نہیں کہ دوطرفہ یا زیادہ فریقی معاہدات کو ترک کر دیا جائے۔ نوآبادیاتی دَور سے چلے آنے والے تلخ احساسات اور محتاجی کے بندھنوں کی

جگہ ایسے معاہدات، ایک ایسی دوستی کا خوش گوار رشتہ استوار کرتے ہیں جو آئینی اور سیاسی مساوات کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔

بہر حال اگر ان معاہدات کو عالم گیر تعاون کے ڈھانچے کے اندر لایا جا سکے تو پھر وہ ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہوں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ مدد لینے والی قوموں میں بے اعتمادی کم ہوگی۔ انھیں یہ خوف کم ہوگا کہ مالی یا فنی امداد کی آڑ میں بعض ایسے مظاہر موجود ہیں جنھیں آج کل نئے نوآبادیاتی نظام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو سیاسی دباؤ اور معاشی تسلّط کی صورت لیتے ہیں اور جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مکمّل غلبہ برقرار رکھا جائے یا حاصل کیا جائے۔

اسلحہ سازی کی دوڑ ناقابل برداشت اسکینڈل ہے

مزید برآں کون نہیں جانتا کہ ایسے فنڈ کی موجودگی میں وہ اقدامات آسان ہو جائیں گے۔ جن کا مقصد یہ ہے کہ خوف یا غرور کے نتیجے میں ہونے والے بعض مسرفانہ اخراجات روکے جا سکیں۔

جب بہت سے لوگ بھوکے ہوں، جب بہت سے کنبے افلاس کا شکار ہوں، جب بہت سے لوگ جہالت کے گڑھے میں ہوں، جب اسکولوں، ہسپتالوں اور واقعی گھر کہلانے والے مکانوں کی ضرورت ہو تو دولت کا تمام نجی ضیاع، قومی یا شخصی طمطراق کے محرّکات پر تمام اخراجات اور اسلحہ سازی کی ہر تھکا دینے والی دوڑ، ایک ناقابلِ برداشت اسکینڈل بن جاتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اس کی مذمت ہمارا فرض ہے۔ کیا اربابِ اقتدار معاملہ حد سے گزر جانے سے پہلے ہمارے الفاظ پر کان دھریں گے؟

تمام قوموں کے درمیان مکالمہ

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام قوموں کے درمیان وہ مکالمہ تخلیق کرنا نہایت ضروری ہے جس کے لیے ہم نے اپنے پہلے گشتی مکتوب ایکلیسیئم سوام میں امید ظاہر کی تھی۔ یہ مکالمہ دولت کا حصّہ دینے والوں اور اس سے فائدہ اٹھانے والوں کے درمیان ہوگا۔ اس سے یہ اندازہ کرنا ممکن ہوگا کہ کتنی مدد ضروری ہے۔ یہ اندازہ صرف سخاوت اور دینے والی قوموں کی دست یاب دولت کے پیشِ نظر ہی نہیں ہوگا بلکہ لینے والے ملکوں کی حقیقی ضروریات اور مالی امداد کے استعمال سے مشروط ہوگا۔

پس ترقی پذیر ممالک کو یہ خطرہ نہیں رہے گا کہ کہیں اُن پر قرضوں کا اتنا بوجھ نہ ہو جائے کہ

اُن سے حاصل شدہ زیادہ تر فائدہ قرضوں کی بیباقی میں وقف ہو جائے۔ سُود کی شرحیں اور قرضے کی واپسی کی میعاد کا ایسا بندوبست ہوسکتا ہے کہ کسی فریق پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ اور اس میں مفت دی جانے والی امداد، بلا سود یا کم سود پر قرضے اور قرضوں کی بیباقی کے لیے مطلوبہ میعاد جیسے مسائل پیشِ نظر رکھے جاسکتے ہیں۔ سرمایہ فراہم کرنے والوں کو ایسی ضمانتیں مہیا کی جاسکتی ہیں کہ سرمائے کا استعمال متفقہ منصوبے کے مطابق اور مناسب کارکردگی کے ساتھ ہوگا کیوں کہ کاسہ لیسوں اور کاہلوں کی حوصلہ افزائی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

قرضے لینے والے ملک بھی یہ مطالبہ کرسکتے ہیں کہ نہ تو ان کی سیاسی زندگی میں کوئی مداخلت کی جائے اور نہ اُن کے معاشری نظام کی جڑوں کو کھوکھلا کیا جائے۔ آزاد اور خود مختار ریاستوں کی حیثیت سے انھیں حق حاصل ہے کہ وہ اپنے معاملات خود چلائیں، اپنی پالیسیاں خود بنائیں اور جس قسم کا معاشرہ چاہیں، آزادی کے ساتھ اس کی تعمیر کی طرف بڑھیں۔

پس ضرورت ایک ایسے نظام کی ہے کہ جس میں آزادانہ تعاون ہو، مؤثر اور باہمی شراکت ہو جس میں فریقین کا وقار مساوی حیثیت میں قائم رہے اور مقصد ایک خوش حال دنیا کی تعمیر ہو۔

عالمی امن داؤ پر

مرتکز، مسلسل، اور جرات مندانہ مساعی کے بغیر مشترکہ کام میں کامیابی نہیں ہوگی۔ بہرحال ہر شخص کو یہ بات جان لینی چاہیے کہ غریب قوموں کی زندگی، ترقی پذیر ملکوں میں شہری امن اور خود عالمی امن داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔

تجارتی روابط میں انصاف

مالی اور تکنیکی بنیاد پر ترقی پذیر ممالک کی امداد کے لیے ہونے والی مساعی خاص طور پر قابلِ غور ہیں، لیکن اگر اُن سے حاصل ہونے والے فوائد دولت مند اور غریب ملکوں کے درمیان تجارتی روابط کے نتیجے میں جزوی طور پر کالعدم ہوجائیں تو یہ مساعی محض سراب بن کر رہ جائیں گی۔ اگر غریب ملکوں میں یہ تاثر پیدا ہو کہ انھیں ایک ہاتھ سے جو دیا جاتا ہے وہ دوسرے ہاتھ سے لے لیا جاتا ہے تو ان ملکوں کے اعتماد کو شدید ٹھیس پہنچے گی۔

بڑھتا ہوا عدم تناسب

اس میں شبہ نہیں کہ اعلا سطح کی صنعتی قومیں زیادہ تر تیار مصنوعات برآمد کرتی ہیں جب کہ کم ترقی یافتہ معیشت والے ممالک صرف خوراک، ریشے دار چیزیں اور دوسرا خام مال بھیجتے ہیں۔ فنی ترقی کی بدولت تیار مصنوعات کی قیمت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور ان کے لیے ایک مناسب منڈی ہمیشہ

مل سکتی ہے۔

اس کے برعکس پس ماندہ ممالک کا پیدا کردہ خام مال قیمتوں میں وسیع اور اچانک اُتار چڑھاؤ کا تابع ہے اور یہ صورتِ حال صنعتی اشیا کی بڑھتی ہوئی قیمتوں سے بالکل لگّا نہیں کھاتی نتیجہ یہ ہے کہ جن قوموں میں صنعت کاری محدود ہے انھیں اس وقت شدید مشکلات سے سابقہ پڑتا ہے جب انھیں اپنی معیشت کو متوازن کرنے اور ترقیاتی منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے برآمدات پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ غریب قومیں ہمیشہ غریب رہتی ہیں اور امیر قومیں امیر تر ہو جاتی ہیں۔

لبرل ازم کیسے؟ لبرل ازم یا دوسرے الفاظ میں آزاد تجارت کا قاعدہ اب بذاتِ خود بین الاقوامی تعلقات کو آگے بڑھانے کے قابل نہیں رہا ہے۔ اس کے فوائد یقیناً ایسی صورت میں واضح ہیں جب متعلقہ فریق معاشی اقتدار میں حد سے زیادہ عدم مساوات سے متاثر نہ ہوں۔ ایسے میں آزاد تجارت ترقی کی محرک ہوتی ہے اور کوشش کا صلہ فراہم کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک اس میں انصاف کا قانون دیکھتے ہیں، لیکن جب معاشی حالات ملک ملک میں بہت وسیع فرق کے حامل ہوں تو پھر صورتِ حال ایک سی نہیں رہتی۔ منڈی میں جو نرخ "آزادانہ" اُبھرتے ہیں، وہ نامنصفانہ نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ تجارتی مبادلے کے قاعدے کی حیثیت سے لبرل ازم کا بنیادی اصول ہے جسے یہاں للکارا جا رہا ہے۔

راستے کی رکاوٹیں۔ وطنیت ایک زیادہ منصفانہ اور عالم گیر اتحاد کے لیے بہتر طور پر منظم دنیا کی تشکیل کے راستے میں دوسری رکاوٹیں بھی موجود ہیں۔ ہم اُن میں سے وطنیت اور نسل پرستی کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ جن قوموں نے حال ہی میں سیاسی آزادی حاصل کی ہے وہ اس قومی اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے مضطرب ہوں جو اب تک کم زور ہے۔ اور وہ اس کی حفاظت کے لیے سعی کریں۔ اسی طرح یہ توقع بھی کی جا سکتی ہے کہ قدیم ثقافت سے مالا مال قومیں اُس میراث پر فخر کریں جو انھوں نے تاریخ سے حاصل کی ہے، لیکن یہ جائز احساسات اُس عالمی نیکی کو بلند تر حیثیت دے سکتے ہیں جو پورے انسانی خاندان پر حاوی ہے۔

وطنیت لوگوں کو اُن کی اصل بھلائی سے دُور رکھتی ہے اور یہ بات اُس وقت خاص طور پر نقصان دہ ہوتی ہے جب قومی معیشتوں کی کم زوری کا تقاضا ہوتا ہے کہ مسائل، علم اور سرمائے کو یک جا کیا جائے تاکہ ترقیاتی پروگراموں پر عمل ہو سکے اور تجارتی اور ثقافتی تبادل بڑھ سکے۔

نسل پرستی نسل پرستی صرف اُن نئی قوموں کا خاصا نہیں جہاں بعض اوقات یہ قبائل اور سیاسی جماعتوں کی رقابتوں میں مضمر ہوتی ہے۔اس سے انصاف کو نقصان پہنچتا ہے اور خانہ جنگی کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔نو آبادیاتی دَور میں نسل پرستی کی آگ آباد کاروں اور مقامی آبادی کے درمیان اکثر بھڑک اُٹھتی تھی اور باہمی طور پر منافع بخش مفاہمت میں حائل ہوتی تھی۔نیز یہ حقیقی بے انصافیوں کے جلو میں تلخیاں لاتی تھی۔

یہ اب بھی ضرر یافتہ قوموں کے درمیان تعاون میں ایک بڑی رکاوٹ ہے اور اُن ملکوں کے اندر نفاق اور نفرت کا سبب ہے جہاں افراد اور خاندان اپنی نسل یا رنگ کی بنا پر غیر منصفانہ انداز میں امتیازی سلوک کے تابع ہیں اور اس وقت بھی، جب افراد اور خاندان دیکھتے ہیں کہ انسانی شخصیت کے اٹوٹ حقوق کی تحقیر ہو رہی ہے۔

ایک متحدہ دنیا کے لیے ہمیں اس صورتِ حال سے گہری پریشانی ہے کیوں کہ اس میں مستقبل کے لیے خطرات پوشیدہ ہیں۔اس کے باوجود ہم پُر امید ہیں کہ آخر کار تعاون کے لیے زیادہ گہرے انداز میں محسوس شدہ ضرورت اور اتحاد کی ایک بلند تر حِس غلط فہمیوں اور خود غرضی پر قابو پالے گی۔

ہمیں امید ہے کہ کم ترقی یافتہ ممالک اپنے سرحداتی قُرب سے یہ فائدہ اٹھانے کے قابل ہوں گے کہ وہ وسیع تر علاقائی بنیاد پر اپنے آپ کو منظّم کر کے مرتکز ترقی کے رقبے قائم کریں گے، مشترکہ طور پر پروگرام بنائیں گے، سرمایہ کاری میں ہم آہنگی پیدا کریں گے، پیداوار کے وسائل آپس میں تقسیم کریں گے اور تجارت بھی منظّم کریں گے۔

ہم یہ امید بھی کرتے ہیں کہ کثیرالاقوامی اور بین الاقوامی جماعتیں مطلوبہ تنظیمِ نو کے وسیلے سے ایسے راستے تلاش کریں گی، جن سے اب تک پس ماندہ رہنے والی قوموں کو یہ موقع ملے کہ وہ اُن رکاوٹوں کو دُور کر دیں جنھوں نے اُن کو خول میں بند کر رکھا ہے اور وہ اپنی فطری صلاحیتوں سے مکمل وفاداری کے پہلو بہ پہلو اپنی معاشرتی اور انسانی ترقی کے لیے جدوجہد کریں۔

اپنی تقدیر کے مالک آپ

یہی وہ نصب العین ہے جو ہمیں حاصل کرنا چاہیے۔ عالمی اتحاد جتنا زیادہ موثّر ہوگا اسی قدر سب قومیں اپنی تقدیر کی مالک آپ بنیں گی۔ جب ہم ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو قوموں کے درمیان متشدّدانہ روابط کا تذکرہ پاتے ہیں، خدا کرے وہ دن طلوع ہو جب بین الاقوامی تعلقات باہمی احترام اور دوستی، تعاون میں ایک دوسرے پر انحصار اور سب کی بھلائی کے لیے ہر فرد کی ذمّے داری سے عبارت ہوں گے۔

نئی اور کم زور قومیں چاہتی ہیں کہ وہ ایک بہتر دنیا کی تعمیر میں زیادہ سرگرم حصّہ لیں یا ایک ایسی دنیا کے لیے جہاں فرد کے حقوق اور پیشے کے لیے زیادہ گہرا احترام موجود ہو۔ یہ ایک جائز اپیل ہے، ہر شخص کو اس پر کان دھرنا اور اس کا جواب دینا چاہیے۔

ترقی اور امن کا نیا نام

قوموں کے درمیان حد سے زیادہ معاشی، معاشرتی اور ثقافتی عدم مساوات کھنچاؤ اور کش مکش کو جنم دیتی ہے اور یہ امن کے لیے خطرہ ہے... امن صرف اس چیز کا نام نہیں کہ طاقت کے ایک نازک توازن کے نتیجے میں جنگ سے گریز رہے۔ نہیں، امن ایک ایسی چیز ہے، جو روز بروز زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ یہ خدا کے اُس حکم کی پیروی کا نام ہے جس کا تقاضا ہے کہ انسانوں کے درمیان انصاف کی ایک زیادہ مکمّل صورت پیدا ہو۔

الگ تھلگ رہنے کا خاتمہ

یہ قوموں کی اپنی بڑی ذمّے داری ہے کہ وہ اپنی ترقی کے لیے کام کریں، لیکن وہ یہ کام دوسروں سے الگ تھلگ رہ کر نہیں کر سکیں گی۔ امن کی طرف لے جانے والی شاہراہِ ترقی کے سنگ ہائے میل یہ ہیں، کم زور قوموں کے درمیان باہمی مدد کے لیے علاقائی معاہدے۔ اُن کی امداد کے دائرے کو وسیع کرنے کی مفاہمت۔ قوموں کے گروہوں میں زیادہ گہرے تعاون کے لیے پروگرام وضع کرنے کے زیادہ دُور رس معاہدات۔

ایک عالمی ہیئتِ حاکمہ کی ضرورت

عالم گیر پیمانے پر یہ بین الاقوامی تعاون ایسے اداروں کا متقاضی ہے جو اس کے لیے تیاری کریں، مساعی میں ہم آہنگی پیدا کریں اور اس کی پیش رفت کے خطوط متعیّن کریں تا آنکہ آخرِکار ایک ایسا عادلانہ نظام قائم ہو جائے جسے ساری دنیا تسلیم کرے۔

ہم دل کی گہرائیوں سے اُن تمام تنظیموں کا حوصلہ بڑھاتے ہیں، جنھوں نے دنیا بھر کی قوموں کی ترقی کے لیے اس تعاون کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ ہماری آرزو ہے کہ ان کے وقار اور اختیار

میں اضافہ ہو۔

جیسا کہ ہم نے نیویارک میں اقوامِ متحدہ کے نمائندوں سے کہا تھا "آپ کا فرض یہ ہے کہ صرف ایک قوم کو بلکہ سب قوموں کو ایک دوسرے سے بھائیوں کا سا سلوک کرنے پر آمادہ کریں۔ کون ہے جو ایسی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ تدریجی انداز میں ایک عالمی حیثیتِ حاکمہ قائم ہو جائے جو اس قابل ہو کہ قانونی اور سیاسی شعبوں میں مؤثر کردار ادا کر سکے؟"

انسانی خاندان کی ترقی

بعض لوگ ان امیدوں کو یوٹوپیائی یا خیالی قرار دیں گے۔ ممکن ہے یہ لوگ کافی حقیقت پسند نہ ہوں اور انھوں نے اس دنیا کے حرکی جوہر کو نہ سمجھا ہو جو زیادہ برادرانہ انداز میں رہنے کی آرزومند ہے اور ایک دنیا اپنی جہالت، اپنی غلطیوں بلکہ گناہوں، بربریت کی جانب رجعت اور نجات کی راہ سے دُور بھٹکنے کے باوجود آج دانستہ طور پر بھی اپنے خالق کی جانب آہستہ، لیکن پختہ قدم اُٹھا رہی ہے۔ عظیم تر انسانیت کو جانے والے اس راستے پر چلنے کے لیے سعی کی بھی ضرورت ہے اور قربانی کی بھی، لیکن اپنے بھائیوں کی محبت کی خاطر مصیبت برداشت کرنا بھی احسن ہے، کیوں کہ اس سے سارے انسانی خاندان کی ترقی کا سامان پیدا ہوتا ہے....

عالمگیر اتحاد

ہم سب انسانوں کو یہ بات یاد کرانے کے آرزومند ہیں کہ موجودہ لمحہ آزمائش کا لمحہ ہے اور کام بے حد اہم ہے۔ عمل کا گجر بج چکا ہے اور کیا کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے؟ بے شمار معصوم بچوں کی بقا، بے شمار فلاکت زدہ خاندانوں کے لیے انسانوں کی سی زندگی تک رسائی۔ عالمی امن، اور تہذیب کا مستقبل۔ وقت آگیا ہے کہ تمام انسان اور تمام قومیں اپنی ذمے داریوں کو محسوس کریں۔

باب سوم - ب

تلوار اور ہل

تخفیفِ اسلحہ سے جو وسائل واگذار ہوتے ہیں، اُن کے مفید استعمال کے لیے اتنے متقابل دعوے ہوتے ہیں کہ ترجیحات کا پیمانہ قائم کرنا اصل مسئلہ بن جاتا ہے۔ اگر اسلحہ بندی کی دوڑ نہ ہوتی تو سب سے اہم اور فوری دعوے کی تکمیل تو بہت بڑی حد تک پہلے ہی ہو چکی ہوتی۔

کسی ملک کے اندر تخفیفِ اسلحہ کے نتیجے میں جو وسائل واگذار ہوتے ہیں انھیں جزوی طور پر ملک میں معاشی اور سماجی ترقی پر اور جزوی طور پر غیر ملکی امداد میں توسیع کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ واگذار شدہ وسائل داخلی ہوں یا خارجی، انھیں جن شہری مقاصد کے لیے بروئے کار لایا جاسکتا ہے، اُن کی تفصیل یہ ہے:

- مصنوعات اور خدمات کے شخصی صَرف کے معیاروں کی بلندی۔
- نئے کارخانوں اور نئے ساز و سامان پر سرمایہ کاری کے ذریعہ سے پیداواری صلاحیت میں توسیع یا اُسے جدید رنگ دینا۔
- مکانوں کی تعمیر، شہروں کی نوک پلک کی درستی، گندے محلوں کا خاتمہ، ترقیِ دیہات۔
- صحت، تعلیم، بہبود، معاشرتی تحفظ، ثقافتی نشو و نما اور سائنسی تحقیق وغیرہ کی سہولتوں میں بہتری اور توسیع۔

تخفیفِ اسلحہ سے واگذار شدہ وسائل کو مندرجہ بالا مقاصد میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مزدوروں کی دوبارہ تربیت ہو سکتی ہے اور جہاں ضروری ہو انھیں دوسرے رقبوں میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ جب پرانا سامان

فرسودہ یا زائد المیعاد ہو جائے تو اس کی جگہ ایسا نیا سامان لیا جا سکتا ہے جو مانگ کے نئے ڈھانچوں سے مطابقت رکھتا ہو۔ لمبے عرصے کے نقطۂ نگاہ سے وسائل کو ضروریات کے مطابق بنانے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آنی چاہیے۔

اس کے برعکس تھوڑے عرصے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیے تو مندرجہ بالا مقاصد میں سے زیادہ محدود انتخاب ہو سکتا ہے۔ تلواروں کو ہل میں بدلنے میں دیر لگتی ہے، اس طرح سپاہی کو دفتری کلرک یا کارخانے کا مزدور بنانے میں بھی دیر لگے گی۔ بعض صنعتی ملکوں میں جو مطالعے ہوئے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوجی استعمال سے واگذار پیداواری صلاحیتوں کو مکانوں کی تعمیر، خوراک اور کپڑے کی پیداوار یا تعلیمی سہولتوں کے لیے بروئے کار لانے سے کہیں زیادہ آسان کام یہ ہے کہ انھیں فوراً صارفین کے لیے پائدار چیزیں اور صنعتی سامان کی پیداوار بڑھانے کے لیے استعمال میں لایا جائے۔

پس عبوری دَور میں ملکوں کی یہ خواہش ہو سکتی ہے کہ وہ صرف زیادہ کھپت، سرمایہ کاری اور غیر ملکی امداد کی نا آسودہ ضروریات ہی کا خیال نہ کریں بلکہ یہ بھی دیکھیں کہ تخفیفِ اسلحہ سے جو خاص وسائل دستیاب ہوں، اُن سے نئے اخراجات کے متبادل انداز کس حد تک پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بعض بڑی فوجی طاقتوں کے پاس پیداواری صلاحیت بدرجۂ وافر موجود ہے۔ ان کے سلسلے میں یہ بات غیر اغلب ہے کہ تخفیفِ اسلحہ سے جو نئی مانگیں ابھریں گی انھیں دست یاب وسائل سے فوراً مناسب حد تک پورا نہیں کیا جا سکے گا۔

مرکزی منصوبہ بندی پر مبنی معیشتیں اگرچہ عام طور پر پوری صلاحیت کے مطابق کارفرما ہوتی ہیں، لیکن اُن میں نسبتاً تھوڑے وقت میں صنعتی صلاحیت اور مزدوروں کی قوت کو پُرامن استعمال کی مصنوعات کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یہ انتقال عمومی معاشی منصوبوں کے ڈھانچے کے اندر مجوّزہ اقدامات کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے اور اس طرح مانگ اور وسائل کے درمیان توازن کا تیقّن ہو سکتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں خالص مالی وسائل سے قطعِ نظر سب سے بڑا واگذار شدہ وسیلہ ہنرمند اور غیر ہنرمند افرادی طاقت ہی پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ بعض صورتوں میں صنعت اور نقل و حمل کی صلاحیت کا ایک اہم حصّہ دوسرے استعمالات کے لیے حاصل ہو سکتا ہے۔ بہت سے ملکوں میں زرِ مبادلہ کی بچت وافر مقدار میں ہو سکتی ہے۔ واگذار شدہ وسائل کے موثر استعمال

کا دارومدار ترقیاتی پروگراموں کے صحیح ہونے، اُن کی قوّت اور موصولہ امداد کی رقم اور نوعیت پر ہوگا۔

شخصی صَرف اور پیداواری سرمایہ کاری

تخفیفِ اسلحہ سے واگذار شدہ وسائل کے متبادل استعمالات میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ ایک بڑا حصہ زیادہ شخصی صَرف میں آجائے گا ... یہ فرض کرنا بھی مناسب ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی زندگی کی سطح کو بلند کرنے کے لیے حکومتوں پر زبردست دباؤ پڑے گا۔ تخفیفِ اسلحہ بالخصوص ایک اہم موقع پیدا کرے گی کہ آبادی میں کم آمدنی والے افراد کی آمدنیاں بڑھائی جائیں اور مردوں اور عورتوں کے معاوضے کی شرحوں کو برابر کرنے کی سہولت ہو۔

تخفیفِ اسلحہ سے جو فائدے ہوں گے اُن میں یہ فائدہ بھی شامل ہو سکتا ہے کہ فرصت میں اضافہ ہو۔ مثلاً حقیقی آمدنی میں کمی کے بغیر کام کے اوقات کی اوسط میں کمی یا باتنخواہ چھٹیوں میں اضافہ۔

بہر حال زیادہ تر ملکوں میں، خواہ آمدنی کی سطح کچھ بھی ہو، تخفیفِ اسلحہ سے واگذار شدہ تمام وسائل براہِ راست اشیائے صرف کے لیے وقف نہیں ہوں گے۔ سب سے پہلے واگذار شدہ وسائل کا ایک اچھا خاصا حصہ پیداواری صلاحیتوں کی توسیع میں استعمال ہوگا کیونکہ یہی توسیع اشیائے صرف کی تیاری میں مزید اضافوں کے لیے ٹھوس بنیاد بن سکتی ہے۔

معاشرتی سرمایہ کاری

ذاتی صرف اور صنعتی اور زرعی سرمایہ کاری، دونوں کے لیے، معاشرتی سرمایہ کاری ایک اہم متبادل ہے۔ اس کا دعوا جزوی طور پر، بہتر معاشرتی سہولتوں کی براہِ راست ضرورت کی واضح شدّت پر قائم ہے۔ اور جزوی طور پر اس حقیقت پر کہ صنعتی اور زرعی بار آوری کے نشوونما کا انحصار تعلیم، اقامت صحت اور دیگر میدانوں میں ترقّی پر ہوتا ہے۔ معاشرتی سرمایہ کاری کو چونکہ سرکاری رُوپے پر فوج کے مطالبے سے مسابقت کا سامنا ہوتا ہے، اس لیے (ترقی پذیر ملکوں کے لیے امداد کی طرح) غالباً یہ بھی اسلحہ کی دوڑ سے خاص طور پر متاثر ہوتی ہے۔

۱۹۵۹ء کے اواخر میں ریاستہائے متحدہ امریکا کی قومی منصوبہ بندی ایسوسی ایشن نے آئندہ پانچ سالوں میں چیدہ چیدہ سرکاری پروگراموں کے مجموعی اخراجات کے تخمینے مرتب کیے

ان کے بارے میں ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ یہ نہایت درست اور صحیح ہوں، بلکہ مقصد صرف یہ تھا کہ ترقیات کے جو پروگرام موجود ہیں اُن کا اور مختلف میدانوں میں آئندہ پانچ سالوں میں بہتری کی تجاویز کا ایک خلاصہ بنا لیا جائے۔ اخراجات کا سالانہ تخمینہ چھیاسٹھ ہزار ملیون ڈالر تک پہنچا۔ اس تخمینے کی اہمیت کو جانچنے کے لیے یہ حقیقت سامنے رکھیے کہ ان تمام مدّات پر اس وقت وفاقی، ریاستی اور مقامی حکومتوں کے سارے پروگراموں پر کل اخراجات تیس ہزار ملیون ڈالر سالانہ کے برابر ہیں۔ اس لیے یہ ظاہر ہے کہ اگر تخفیفِ اسلحہ ہو تو اس سے واگذار وسائل کا زیادہ حصّہ ان پروگراموں میں کھپ سکتا ہے۔

سوویت یونین نے فیصلہ کیا ہے کہ آبادی کی آمدنی بڑھا کر اور معاشرتی فوائد (تعلیم، صحت کی حفاظت، معاشرتی بیمہ، مکانات کی تعمیر وغیرہ) میں توسیع کر کے آنے والے بیس سالوں میں معیارِ زندگی میں واضح بہتری کا بندوبست کیا جائے۔ ایک سرکاری دستاویز میں درج ہے، "اگر مملکتوں کے درمیان ایک مناسب معاہدے کی بنیاد پر عمومی اور مکمل تخفیفِ اسلحہ کا بندوبست ہو جائے، تو اس سے محنت کشوں کے معیارِ زندگی میں منصوبے کے مطابق ترقی کا کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔"

شہروں کی کایا پلٹ کا مسئلہ عالم گیر ہے۔ ۱۹۵۰ء میں دنیا کی اسّی فی صد آبادی دیہی علاقوں میں رہتی تھی۔ دنیا کی کل آبادی میں ہر سال پچاس سے ساٹھ ملیون کے درمیان اضافہ ہو رہا ہے اور یہ زیادہ تر شہری علاقوں سے مخصوص ہے۔ ایشیا میں جن شہروں کی آبادی بیس ہزار سے متجاوز ہے، اُن کی مجموعی آبادی میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۵ء تک پانچ سو ملیون افراد کا اضافہ ہو چکا ہو گا۔ لاطینی امریکا کے ایک لاکھ سے متجاوز آبادی کے باسٹھ شہروں کی مجموعی آبادی ۱۹۶۰ء میں اس پورے خطّے کی کل آبادی کا چالیس فی صد تھی۔ افریقہ میں دیہی علاقوں کے مقابلوں میں شہری علاقوں میں اضافۂ آبادی کی شرح بہت زیادہ ہے۔ یورپ اور شمالی امریکا میں بھی شہری آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

بہت سے ملکوں میں دیہی اور شہری ماحول رو بہ زوال ہے اور یہ کیفیت تیز رفتار نشوونما کے زیرِ اثر ہے۔ اس کی معاشرتی اور مادّی علامتیں یہ ہیں: خراب مکان۔ خدمتِ عامّہ کا ادنا معیار اور اس سے غفلت، شہری ٹریفک کی بے قاعدگی اور بہت سے کم ترقی یافتہ ملکوں میں حفظِ صحت کی عدم موجودگی اور متعدّی امراض کی کثرت۔ ایسے کم ترقی یافتہ

ملکوں کے بہت سے بڑے شہروں میں آبادی کا ایک خاصا حصہ ایسی بستیوں میں رہتا ہے جو زبردستی بسا لی گئی ہیں۔

صرف ہندوستان کے بارے میں اندازہ ہے کہ وہاں ایک لاکھ سے متجاوز نئے شہری باشندوں کے لیے ایک ہزار ملیون ڈالر سالانہ کی رقم درکار ہوگی اور اگر اس میں شہر گیر خدمات، افادۂ عام کے وسیلے اور وسائل نقل و حمل بھی شامل کر دیے جائیں تو اس کے لیے کم از کم دوگنا رقم درکار ہوگی۔

امریکی ریاستوں کی تنظیم نے ۱۹۶۴ء میں لاطینی امریکہ کے سلسلے میں اندازہ لگایا تھا کہ مکانوں کی قلّت کو ختم کرنے، زائد المیعاد گھروں کو دوبارہ بنانے اور نئے گھروں کی تعمیر کے لیے آئندہ تیس سالوں میں ۱۴ ہزار ملیون ڈالر سالانہ رقم کی ضرورت ہوگی۔ اقوام متحدہ کے معاشرتی امور کے دفتر کے موٹے سے اندازے کے مطابق کم ترقی یافتہ ملکوں کے ڈیڑھ ملیون خاندانوں کے لیے مناسب گھروں کی ضرورت ہے۔ یہی وہ بڑے تقاضے ہیں جو بہت سے ترقی پذیر ملکوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ مکانات اور شہروں کی ترقی پر اتنی بڑی رقوم صرف کریں کہ اس کے نتیجے میں براہِ راست پیدا آوری شعبوں کے بڑھتے ہوئے مطالبوں میں کمی کرنی پڑے۔

سوویت یونین نے پانچ سال کے عرصے میں پچاس ملیون افراد کے لیے مکان بنا لیے، لیکن مکانوں کی قلّت اب بھی موجود ہے۔ قلّت پر قابو پانے اور ہر کنبے کے لیے "ایک علاحدہ آرام دہ مکان" مہیا کرنے کے لیے اگلے بیس سالوں کے دوران میں مکانوں کی موجودہ سہولتوں میں دو سو فی صد اضافہ درکار ہوگا۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے مکانات کی سالانہ تعمیر کے ۶۵-۱۹۶۱ء کے ایک سو پینتیس (۱۳۵) ملیون مربع میٹر رقبے کو ۸۰-۱۹۷۶ء تک چار سو ملیون مربع میٹر رقبے تک پہنچانا ہوگا۔

بہت سے ملکوں میں سڑکوں اور فضائی نقل و حمل کے وسائل کے لیے بھی معاشرتی سرمائے کی فراہمی میں کمی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ان ملکوں میں موٹروں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے، لیکن شاہراہی سہولتیں کم ہیں۔ چناں چہ ٹریفک کا ہجوم بڑھ گیا ہے اور حادثات کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ بہت سے ترقی پذیر ملکوں، بلکہ بعض نہایت ترقی یافتہ معیشتوں میں بھی فضائی مستقروں اور دوسری فضائی سہولتوں کی

بڑی کمی ہے اور تخفیفِ اسلحہ سے واگذار وسائل میں سے شہری ہوا بازی پر سرمایہ کاری کے لیے بھی حصّہ وقف کرنا ہوگا۔

قدرتی وسائل کا فروغ اور حفاظت ایک اور اہم شعبہ ہے، جس میں تخفیفِ اسلحہ کی صورت میں زیادہ رقوم صَرف کرنی ہوں گی۔ ریاستہائے متحدہ امریکا میں اندازہ کیا گیا ہے کہ صرف آبی وسائل کے فروغ کے شعبے میں ۱۹۸۰ء تک وفاقی اخراجات پچپن ہزار ملیون ڈالر تک پہنچیں گے جب کہ غیر وفاقی اخراجات کے لیے ایک سَو تہتّر ہزار ملیون ڈالر کی رقم درکار ہوگی۔ سوویت یونین عوام کے رہن سہن اور کام کے حالات کو بہتر بنانے کی خاطر ملک کے مختلف حصّوں میں فطرت کو نیا روپ دینے والے اہم منصوبوں کی تیاری اور اُن پر عمل درآمد کے کام کو آگے بڑھا سکتا ہے، مثلاً ایک منصوبہ یہ ہے کہ بحرِ منجمد شمالی میں بہنے والے تین دریاؤں ــ پچورا، وائی چیگڈا اور اوب ــ کے پانیوں کا ایک حصّہ دریائے والگا کی وادیوں اور بحیرۂ خزر اور بحیرۂ ارال میں ڈال دیا جائے۔ اس سے وسطی ایشیا، اور سوویت یونین کے جنوبی یورپی حصّے کے موسم اور رہن سہن کے حالات میں خاصی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں بھی بہت سے ایسے اہم مختلف المقاصد منصوبے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ آبی وسائل کی حفاظت کی جائے اور اُن سے فائدہ اٹھایا جائے۔

دنیا میں پانی کی مانگ رسد کے مقابلے میں بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے زیادہ رسد صرف اس لئے درکار نہیں کہ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری کرے بلکہ اس لیے بھی کہ آب پاشی اور صنعت کے لیے اس سے بھی زیادہ تیز رفتار کے ساتھ پانی کی ضرورت ہے۔ مزید توسیع کے لیے بڑھتی ہوئی بھاری سرمایہ کاری لازماً درآمد ہوگی تاکہ دوسرے وسائل تک (بشمول سمندری پانی کی تطہیر کے) رسائی ہو سکے۔

قدرتی وسائل کی ترقی اور حفاظت کے دوسرے فوری تقاضے یہ ہیں: ترقی جنگلات، زمین اور فاضل آب کی حفاظت، چراگاہوں کا تحفظ، پارکوں اور تفریح گاہوں کی ترقی اور مچھلیوں اور دوسرے جنگلی جانوروں کی حفاظت۔

صحت، تعلیم اور معاشرتی خدمات میں سرمایہ کاری

ایک فوری ضرورت یہ ہے کہ دنیا بھر میں صحی خدمات کو بہتر بنایا جائے۔ بہت سے ملکوں میں ڈاکٹروں، دندان سازوں اور دوسرے طبّی کارکنوں

کا تناسب آبادی کے مقابلے میں ناکافی بلکہ رُو بہ زوال ہے۔ نیز ہسپتالوں کی تعداد، ہسپتالوں میں مریضوں کی گنجائش اور دوسری بنیادی طبّی سہولتوں میں بڑی کمی ہے۔ مثلاً یورپ کے بعض غریب ملکوں میں جتنی طبّی سہولتیں فی ڈاکٹر دستیاب ہیں، وہ بہتر سامان سے لیس ملکوں کے برابر سے بھی کم ہیں۔ اس کے باوجود امیر ترین ملکوں میں بھی طبّی خدمات کے معیار بڑھانے کی بڑی ضرورت ہے۔ مثلاً کنیڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ہسپتالوں میں مہیا "بستروں" میں کمی یا اندازہ موجودہ تعداد کے ایک چوتھائی سے نصف تک کے درمیان ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں بہتر طبّی دیکھ بھال کی ضرورت اور بھی واضح ہے۔ ان میں سے بہت سے ملکوں میں بچوں کی شرح اموات فی ہزار ایک سو سے زیادہ ہے اس کے مقابلے میں معاشی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں یہی شرح بیس سے تیس تک فی ہزار ہے۔

طبّی دیکھ بھال پر سرمایہ کاری کے تقاضوں کی وسعت کا اندازہ کرنا ہو تو ریاست ہائے متحدہ امریکا کے منصوبوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔ تعمیر کی موجودہ شرح میں اگر بحالیاتی سہولتوں میں بہتری، جدید انداز سے مطابقت اور اضافے کو شامل کر لیا جائے تو اگلے عشرے کے لیے کم از کم پندرہ ہزار ملیون ڈالر درکار ہوں گے، لیکن اگر تبدیلیاں مقصود نہ ہوں نو ہزار ملیون ڈالر کی ضرورت ہوگی۔ سوویت یونین میں سرکاری طور پر بتایا گیا ہے کہ اگر اس وقت فوج کے زیرِ استعمال عمارات میں سے بعض کو تھوڑی لاگت پر ہسپتالوں میں بدل دیا جائے تو اس سے ہسپتالوں کی گنجائش میں چالیس فی صد اضافہ ممکن ہے، یعنی لاکھوں بستروں کا اضافہ۔

زیادہ تر ترقی یافتہ ملکوں میں تعلیمی ضروریات بڑھ رہی ہیں اور آگے چل کر یہ زیادہ تیزی سے بڑھیں گی۔ جوں جوں تکنیکی ترقی کا دائرہ وسیع تر ہوگا، ایک اعلیٰ تر تعلیمی پس منظر، بہتر سائنسی اور تکنیکی ہُنر اور علم کے ایک وسیع تر دائرے کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی پہلے سے زیادہ کوشش کی جائے گی کہ کم ذہین طلبہ کے ترکِ تعلیم کی شرح کم ہو، اور یہ یقین دہانی ہو کہ نہایت ذہین نوجوانوں کا بڑھتا ہوا تناسب تعلیم کی بالائی سطحوں تک پہنچے۔ ان تمام مقاصد کی تکمیل کا تقاضا یہ ہوگا کہ تعلیم کی نئی قسمیں رائج کی جائیں اور اس کے لیے کافی وسائل مہیا ہوں تاکہ لوگ علم کی دنیا میں تازہ ترین حالات سے واقف رہیں۔

زیادہ تر ترقی پذیر ممالک میں اب بھی یہ کیفیت ہے کہ پندرہ سال اور اس سے زیادہ عمر کی آبادی میں پچاس فی صد سے زیادہ لوگ ناخواندہ ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں میں تعلیمی تقاضوں کی لاگت کی ایک مثال اس پروگرام سے ملتی ہے جو حال میں افریقہ اپنایا گیا۔[1] اس پروگرام کی کُل لاگت میں اضافے کا گوشوارہ یہ ہے :

۱۹۶۱ء	۵۹۰ ملیون ڈالر
۱۹۶۵ء	ایک ہزار ایک سو پچاس ملیون ڈالر
۱۹۷۰ء	ایک ہزار ۸سو ۰۸ملیون ڈالر
۱۹۸۰ء	۲ہزار ۶ سو ملیون

یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ قومی آمدنی میں تعلیم کا حصہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک بڑھ کر تین سے چار فی صد ہو جائے گا۔ اس کے بعد یہ مزید بڑھے گا۔ اور ۱۹۸۰ء میں قومی آمدن کا چھے فی صد ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھی سالوں میں بالترتیب ۱۴۰ ملیون ڈالر، ۴۵۰ ملیون ڈالر، ۱۰۱۰ ملیون ڈالر اور ۴۰۰ ملیون ڈالر کا فرق غیر ملکی امداد سے پورا کرنا ہوگا۔

معاشرتی خدمات میں بھی توسیع کے فوری تقاضے موجود ہیں۔ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی بہبود اطفال کی خدمات، پیشہ ورانہ بحالیاتی ادارے، اجتماعی مراکز اور دوسری خصوصی خدمات بہت کم دست یاب ہیں۔ آبادی میں اضافے کی حالیہ تیز رفتار اور فنی تبدیلیاں اس امر کو یقینی بناتی ہیں کہ ان خدمات کی ضرورت اور مانگ بڑھے گی۔ اس لیے یہ امکان موجود ہے کہ معاشرتی سرمایہ کاری بڑھتے ہوئے وسائل چاہے گی جس میں تخفیفِ اسلحہ ایک خوش گوار کردار ادا کر سکے گی۔

پر امن مقاصد کے لیے سائنسی تخلیق آج کل بڑے ملکوں میں قومی تحقیق اور ترقیاتی سعی کا ایک اہم حصہ فوجی مقاصد کو پورا کرتا ہے۔ پس تخفیفِ اسلحہ سے یہ ممکن ہو جائے گا کہ اُن شعبوں میں بنیادی سائنسی

---

[1] اقوامِ متحدہ کا معاشی کمیشن برائے افریقہ اور یونیسکو "افریقی تعلیمی ترقی کے ایک منصوبے کا خاکہ" یہ منصوبہ افریقہ کے پینتیس ممالک اور علاقوں پر حاوی ہے۔

تحقیق کے پروگراموں کی حوصلہ افزائی کی جائے جن سے اب تک غفلت برتی گئی ہے۔ نیز طب، شہری ترقیات اور تنظیمِ نو اور ترقی پذیر ممالک کی معاشی ترقی سے تعلق رکھنے والے فنی مسائل جیسے دنیا کے بعض عظیم ترین مسائل کے حل کے لیے عظیم سائنسی صلاحیت کو حرکت میں لایا جائے۔ اگر انسانی اختراع نے چند سالوں کے اندر اندر بربادی کے لیے انسان کی قوتوں میں اتنا بڑا اضافہ کر لیا ہے تو اس کے لیے یہ بھی ممکن ہونا چاہیے کہ وہ پُرامن اور تعمیری کارِ نمایاں میں بھی اس کے برابر ایک بڑا کردار ادا کرے۔

بعض صورتوں میں مذکورہ ضروریات کی تکمیل کے لیے بین الاقوامی تعاون کی ضرورت ہوگی۔ موسمی مشاہدات کے مراکز کا جو مستقل عالم گیر جال بچھا ہوا ہے، اُس میں اور مواصلات کی سہولتوں میں سنگین خلا موجود ہیں۔ موسمی خدمات کو بہتر بنانے کی طرح بنیادی تحقیق کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ رقوم درکار ہیں۔ اس طرح نقل و حمل کی عالمی فضائی سہولتوں کو ترقی دینے کے لیے بھی بین الاقوامی تعاون کی خاصی گنجائش ہے۔

تخفیفِ اسلحہ زیادہ پُرعزم نوعیت کی مشترکہ بین الاقوامی مہمات کے امکانات پیدا کر دے گی۔ اُن میں پُرامن مقاصد کے لیے ایٹمی قوت کا استعمال، خلائی تحقیق، نوعِ انسانی کے فائدے کے لیے قطب شمالی اور قطب جنوبی کی تحقیق اور دنیا کے بڑے خطّوں میں آب و ہوا کو بدلنے کے منصوبے شامل ہیں۔ زمین کی تہوں کے سلسلے میں مشترکہ تحقیق سے ایسی ایجادات ممکن ہیں جو ساری دنیا کے لیے حقیقی قدر و قیمت کی حامل ہوں گی۔ اس کے علاوہ ترقی پذیر ملکوں کے فائدے کے لیے مشترکہ منصوبے بنائے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح معاشی اور معاشرتی شعبوں میں تعاون کے پروگرام شروع کیے جا سکتے ہیں۔ یہ بین الاقوامی منصوبے عالمی معیارِ زندگی اور تہذیب پر بڑا اثر ڈال سکتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ تخفیفِ اسلحہ سے واگذار وسائل اتنے زیادہ نہیں ہوں گے کہ سارے تقاضے پورے کر سکیں۔ اگرچہ واگذار وسائل کو بروئے کار لانے کے پروگراموں کے بارے میں حکومتیں ہی قومی اور بین الاقوامی ضرورت کی روشنی میں سرگرم فیصلے کریں گی، لیکن یہ بات بہت واضح ہے کہ کسی ملک کو اس اندیشے کی ضرورت نہیں کہ تخفیفِ اسلحہ سے حاصل ہونے والے وسائل کو مفید مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کوئی چیز حائل ہوگی۔

ضمیمہ : الف

دوسری عالمی جنگ کے بعد ایک سو جنگیں اور دوسرے مجادلے

دوسری عالمی جنگ کے خاتمے سے لے کر اِس وقت تک ایک سو سے زیادہ جنگیں یا دوسرے بین الاقوامی اور قومی مجادلے یا تنازعات ہو چکے ہیں۔ ان کے پیمانے کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ واشگاف بین الاقوامی جنگیں بھی ہوئیں بڑی بڑی خانہ جنگیاں بھی ہوئیں اور ایسے واقعات بھی جن میں مجادلے کی کیفیت اور شدّت میں فرق تھا۔ ان صفحات پہ ہم علاقہ وار اُن تمام بڑے اور دوسرے مجادلوں کی ایک فہرست پیش کر رہے ہیں جو ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۸ء تک دنیا کے مختلف حصّوں میں اُبھرے۔ امن کتنی نازک چیز ہے! —— مندرجہ ذیل حقائق اُن گوشواروں پر مبنی ہیں جو ۱۹۶۸ - ۶۹ء میں عالمی اسلحہ اور تخفیفِ اسلحہ کی ایئر بک سپری میں درج ہیں۔

یورپ

یونان کی خانہ جنگی (یونان، یوگوسلاویہ، البانیہ، بلغاریہ، امریکا)؛ برلین کا بحران (سوویت یونین اور شمالی اوقیانوس کی دفاعی تنظیم یعنی نیٹو)؛ ٹری ایسٹ کا مسئلہ (یوگوسلاویہ، اٹلی)؛ سمندر پار کے ماہی گیری کے حقوق (برطانیہ، البانیہ)؛ آزادیٔ قبرص (برطانیہ اور ایوکا کی فوج: ایوکا یونانیوں کی خفیہ فوجی تنظیم کا نام ہے)؛ ہنگری کا بحران (سوویت یونین، ہنگری)؛ قبرص (قبرص، یونان، ترکی، اقوامِ متحدہ کی مداخلت)؛ یونان کا فوجی انقلاب (شہری حکومت اور سیاسی جماعتیں، فوجی جُنتا)؛ قبرص کا مسئلہ (شہری حکومت اور یونان، ترک اقلیت اور ترکی)؛ چیکوسلوواکیہ کا بحران؛

(چیکوسلوواکیہ، سوویت یونین، پولینڈ، مشرقی جرمنی، بلغاریہ، ہنگری)۔

مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ

ایران (ایران، سوویت یونین)؛ آزادیٔ مصر (برطانیہ، مصر)؛ مسئلۂ فلسطین (اسرائیل، مصر، عراق، اردن، شام، لبنان)؛ عرب اسرائیل جنگ [1] (اسرائیل، مصر، عراق، اردن، شام، لبنان)؛ مراکش (فرانس، مراکش)؛ تونس (تونس، فرانس)؛ ایران (برطانیہ، ایران)؛ الجزائر کی جنگِ آزادی (فرانس، الجزائر)؛ عدن و یمن کی سرحد (برطانیہ، یمنی قبائل)؛ سوئز پر حملہ (برطانیہ، فرانس، اسرائیل، مصر)؛ سینا کی مہم (اسرائیل، مصر)؛ ہسپانوی مراکش (ہسپانیہ، مراکش)؛ مسقط و اومان کی بغاوت (برطانیہ، مسقط و اومان)؛ لبنان اور لبنان کی خانہ جنگی (برطانیہ، امریکا، اردن، لبنان)؛ موصل (عراق) کی بغاوت (عراقی حکومت، باغی افسر)؛ تونس میں بنزرتہ کا بحران (فرانس، تونس)؛ عراق اور کُرد باشندے (شہری حکومت اور باشندے)؛ کویت میں مداخلت (عراق، کویت، برطانیہ، عرب لیگ)؛ مراکش اور الجزائر کی سرحد (مراکش، الجزائر، افریقی ریاستوں کی تنظیم کی طرف سے مداخلت)؛ یمن کی خانہ جنگی (شاہ پسند، جمہوریت پسند، متحدہ عرب جمہوریہ، سعودی عرب)؛ عدن کی خانہ جنگی (برطانیہ، عدن، متحدہ عرب جمہوریہ اور یمن)؛ شام کا فوجی انقلاب (شہری حکومت، فوجی باغی)؛ عرب اسرائیل جنگ [2] (اسرائیل، متحدہ عرب جمہوریہ، اردن، شام، عراق، لبنان)۔

مشرقِ بعید اور جنوبی ایشیا

انڈونیشیا کی جنگِ آزادی (ڈچ حکومت، قوم پرست)؛ ہند چینی جنگ ویت نام جنگ [1] (فرانس، ہند چینی، لاؤس اور کمبوڈیا)؛ چین کی خانہ جنگی (کومن تانگ، چینی کمیونسٹ پارٹی، امریکا)؛ ہندی فرقہ وارانہ فسادات (ہندستان، پاکستان)؛ تائی وان۔ فارموسا (کومن تانگ، تائی وان کے لوگ)؛ حیدر آباد، ہندستان (حکومتِ ہند، نظام اور مسلمان)؛ کشمیر (ہندستان، پاکستان)؛ فلپینیز کی خانہ جنگی (حکومتِ فلپینیز، ہک بالاہاپ باغی)؛ برما کی خانہ جنگی (برمی حکومت، کرن اور شان قبائلی)؛ ملایا میں بغاوت (برطانیہ، ملایا، اور ملایا کی کمیونسٹ پارٹی)؛ برما

کا سرحدی تنازعہ (برما کومن تانگ کی فوج)؛ جنگِ کوریا (شمالی کوریا، عوامی
جمہوریہ چین، جمہوریہ کوریا، امریکا، اقوامِ متحدہ)؛ جنگِ تبت ۱ (حکومتِ تبت، عوامی
جمہوریہ چین)؛ کیومائے اور ماٹسو کے جزائر (عوامی جمہوریہ چین، جمہوریہ چین (تائی وان)،
امریکا)؛ تبت ۲ (عوامی جمہوریۂ چین، تبت کے چھاپہ مار)؛ جنگِ ویت نام ۲ (شمالی
ویت نام، جنوبی ویت نام، امریکا)؛ ہندستان میں ناگا بغاوت (ہندستانی حکومت،
ناگا قبائل)؛ برمی سرحدی تنازعہ (برما، عوامی جمہوریہ چین)؛ انڈونیشی خانہ جنگی
(حکومت، کمیونسٹ)؛ لاؤس کی خانہ جنگی (شاہ پسند، جمہوریت پسند)؛ لانگ جو
اور لداخ کے واقعات (عوامی جمہوریہ چین، ہندستان)؛ تھائی لینڈ کمبوڈیا سرحد
(کمبوڈیا، تھائی لینڈ)؛ مغربی آئرین (انڈونیشیا، نیدرلینڈز)؛ گوا ہندستان (ہندستان،
پرتگال)؛ نیپال میں خانہ جنگی (حکومت، باغی)؛ جنگِ ویت نام ۳ (جنوبی
ویت نام، قومی محاذِ آزادی، شمالی ویت نام، امریکا، فلپین، جنوبی کوریا، تھائی لینڈ،
اوسٹریلیا، نیوزی لینڈ)؛ برونائی کی بغاوت (برونائی، برطانیہ، ساراواک، شمالی بورنیو)؛
ہندستان کی سرحدی جنگ (ہندستان عوامی جمہوریہ چین)؛ ملائشیا میں
محاذ آرائی (انڈونیشیا، ملائشیا، برطانیہ، نیوزی لینڈ)؛ تھائی لینڈ میں بغاوت
(حکومت، باغی، امریکا)؛ رن آف کچھ (ہندستان، پاکستان) پاکستان ہندستان
جنگ (پاکستان، ہندستان)؛ انڈونیشی بحران (حکومت، باغی)۔

لاطینی امریکا

بولیویا (حکومت، باغی)؛ بولیویا (حکومت، باغی)؛ پیراگوئے (حکومت،
باغی)؛ کاسٹاریکا (کاسٹاریکا، نکاراگوا)؛ کولمبیا (حکومت، باغی)؛ ہنڈوراس
(ہنڈوراس، نکاراگوا)؛ ہنڈوراس (ہنڈوراس، نکاراگوا، گوئٹے مالا) نکاراگوا،
گوائٹے مالا)؛ گوائٹے مالا میں مداخلت (گوئٹے مالا، امریکا)؛ کیوبا (حکومت،
کاسترو کے حامی)؛ وینیزوئیلا (وینیزوئیلا، جمہوریۂ ڈومینی کن)؛ ڈومینی کن ری پبلک
جمہوریۂ ڈومینی کن، امریکا)؛ کیوبا، بے آف پگز (کیوبا، امریکا)؛ کیوبا کا بحران (کیوبا،
سوویت یونین، امریکا)؛ کیوبا کا میزائلی بحران (کیوبا، سوویت یونین، امریکا، امریکی
ریاستوں کی تنظیم)؛ پاناما (پانامہ، امریکا)؛ گوائٹے مالا (حکومت، باغی)؛ ڈومینی

کنٹ جمہوریہ (حکومت، باغی، امریکی، امریکی ریاستوں کی تنظیم)؛ پیرو (حکومت باغی)

افریقہ

مدغاسکو (فرانس، مدغاسکر)؛ کینیا، ماؤماؤ (برطانیہ، ماؤماؤ)؛ کیمرون (فرانس، برطانیہ، قوم پرست)؛ روآنڈا، ارونڈی (بہوتوس اور واٹوسی)؛ کانگو (کانگو، صوبہ کاتنگا، اقوامِ متحدہ کی افواج)؛ انگولا (پرتگال، انگولا کے لوگ)؛ صومالیہ حبشہ (صومالیہ، حبشہ)؛ بورونڈی (روآنڈا، بورونڈی)؛ پرتگیزی گنی (پرتگیزی حکومت، قوم پرست)؛ کینیا، صومالیہ (کینیا، صومالیہ، برطانیہ)؛ مشرقی افریقہ کی بغاوتیں (کینیا، یوگنڈا، ٹانگانیکا، برطانیہ)؛ کانگو۔کنشاسا (حکومت، باغی، بلجیئم، امریکا)؛ موزنبیق (پرتگال، قوم پرست)؛ نائجیریا (فوجی انقلاب حکومت، فوج)؛ گھانا (فوجی انقلاب، حکومت، فوج)؛ کانگو، کنشاسا (کنگانی بغاوت، حکومت، فوج)؛ روڈیشیا کا بحران (برطانیہ۔سفید فام اقلیتی حکومت)؛ نائجیریا (حکومت، بیافرا کے باغی)؛ سوڈان، یوگنڈا (سوڈان، یوگنڈا)۔

فوٹو "سوویٹ یونین"

۵ اگست ۱۹۶۳ء کو ماسکو میں ایٹمی تجربات کو ممنوع قرار دینے کے جس معاہدے پر دستخط ہوئے اس کی رُو سے فضا میں، خلا میں اور زیر آب ایٹمی ہتھیاروں کی آزمائش بند کردی گئی۔ فرانس اور عوامی جمہوریہ چین نے دستخط نہیں کیے تھے اور انھوں نے فضا میں ایٹمی تجربات کیے ہیں۔

بالائی تصویر:۔ سائنس داں ایک ایسا ریڈیو گرام دیکھ رہا ہے۔ جو فضا میں تاب کاری سے آلودگی کا انکشاف کرتا ہے۔ تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاہدۂ ماسکو کے بعد ایٹمی گرد سے آلودگی خاصی کم ہوگئی ہے۔

اوپر بائیں جانب کی تصویر: ۱۹۶۲ء کے موسمِ خزاں کا ریڈیو گرام ہوا میں تابکار ذرات کی گنجائی ظاہر کرتا ہے۔

اوپر دائیں جانب کی تصویر۔ ۱۹۶۵ء کے ریڈیو گرام میں صرف چار نشانات ہیں جنھیں دائرے کے اندر دکھایا گیا ہے۔

۷۴

ضمیمہ "ب"

ایٹم کے اس پار سے آوازیں

۱۹۴۵ء میں ایٹم بموں سے ہیروشیما اور ناگاساکی کی بربادی کے چشم دید واقعات کی کہانی، دو جاپانیوں کی زبانی۔ یہ متن ایک کتاب سے لیے گئے ہیں جو ۱۹۶۱ء میں وفاقی جمہوریۂ جرمنی میں شائع ہوئی۔ اس کا نام ہے "نوعِ انسانی کی پکار"۔ مؤلف کا نام ہانس والٹر بھر ہے۔ اسے میونخ کے ناشر آر۔ پائیپر اینڈ کو نے چھاپا۔ یہ کتاب اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک کے عرصے میں دُنیا کے تمام حصّوں سے اُن مردوں اور عورتوں نے لکھے جنھوں نے دوسری عالمی جنگ میں اپنی جانیں گنوا دیں۔

ناگاساکی سے خط

از تکاشی ناگائی

ولادت ۱۹۰۸۔ ناگاساکی کی فیکلٹی اوف میڈیسن میں پروفیسر۔ ناگاساکی، ۱۹۴۵ء۔

جو لوگ بم پھٹنے کے فوراً بعد بھی حرکت کر سکتے تھے اُن پر براہِ راست ردِّ عمل یہ تھا کہ یا تو وہ وہیں کھڑے رہیں، جہاں وہ دھماکے کے وقت کھڑے تھے یا فوراً بھاگ جائیں۔ جو لوگ وہیں رہے جہاں تھے تاکہ زخمی دوستوں کی مدد کریں یا اپنا مکان، دفتر یا کارخانہ بچانے کی کوشش کریں، وہ بہت جلد شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے اور اُن لوگوں سمیت موت کے گھاٹ اتر گئے جنھیں وہ بچانا چاہتے تھے۔ جب آگ نزدیک آئی تو ہم نے اپنے ہسپتال کے نزدیک پہاڑی پر پناہ لی۔ اس طرح میں اور میرے ہمسائے موت سے بال بال بچ گئے۔

پہاڑی تک پہنچنے کا مطلب تھا، ایک جلتے ہوئے جنگل میں راستہ تلاش کرنا ہمارے

گرد بڑے بڑے شعلے لپک لپک کر آ رہے تھے وہ ہمارے سروں کے اُوپر تک بلند ہو رہے تھے۔ کبھی آگے بڑھتے، کبھی پیچھے۔ ہوا کے رُخ کے ساتھ ساتھ اُن کا رُخ بھی بدل جاتا اور ہم پر اُوپر سے انگاروں کی بے پناہ بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ میڈیکل طلبہ اور نرسیں زمین پر پڑی ہیں۔ ہم نے انھیں اٹھایا اور پہاڑی کی طرف کچھ اوپر لے گئے۔ اس طرح انھیں آگ کی لپیٹ سے بچالیا۔ سارا وقت میں اپنے ارد گرد کے آدمیوں کو پُکار پُکار کر یہی کہتا رہا کہ تیزی سے اور بھاگ کر چلو۔

میری دائیں کن پٹی میں گہرا زخم آیا ہوا تھا۔ اس سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا جس کی تاب نہ لاکر میں گر گیا۔ شعبۂ جراحی کے پروفیسر شیراڈے نے میرے زخم کی دیکھ بھال فرمائی اور جلدی سے گھاؤ کو ٹانکے لگادیے۔ کچھ لمحات کے لیے میں ہوش کھو بیٹھا۔ جب میں اپنے آپ میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایٹمی بادل کے موجیں مارتے ہوئے دھوئیں کے نیچے گھاس پر دراز ہوں۔ زخم میں درد سے میں بے حال تھا۔ اتنا بے حال کہ درد پر قابو پانے کے لیے دانت کسکساتا تھا۔ پھر میں اپنی بیوی کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے سوچا "اگر وہ زندہ ہوتی تو اس وقت تک مجھ سے ضرور ملتی۔"

اگلے دن ہسپتال کے پیچھے میں نے پہاڑی سے نیچے کی طرف نظر ڈالی۔ تو میرا گھر کھنڈر بن چکا تھا۔ سفید راکھ کے ایک بڑے انبار کے سوا "اور اکامی" کا کچھ بھی نہ بچا تھا۔ صبح کی چمکیلی واضح روشنی میں جدھر نظر ڈالتا تھا ہر چیز ساکت تھی۔ کوئی حرکت نظر نہیں آتی تھی۔

ہمارے لیے ایٹم بم ایک بالکل غیر متوقع چیز تھی۔ جس وقت بم پھٹا۔ اس وقت میں ریڈیو تھراپی کے کمرے میں تھا۔ اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نہ صرف حال برباد ہو کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہے بلکہ ماضی بھی ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے نابود ہو گیا ہے اور مستقبل بھی بالکل برباد ہو گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میرے محبوب اساتذہ اور میری محبت کے مرکز تمام طلبہ اچانک شعلوں کی لپیٹ میں گم ہو گئے ہیں۔ میری بیوی کا کچھ نہیں بچا تھا سوائے جلی ہوئی ہڈیوں کے ایک چھوٹے سے ڈھیر کے، جو میں نے گھر کے کھنڈروں سے ایک ایک کر کے تلاش کی تھیں اور ان ہڈیوں کا بھی کیا رہ گیا تھا۔ ان کا وزن اتنا تھا جتنا کسی پارسل میں ڈال کر بذریعہ ڈاک بھیج دیا جاتا ہے۔ وہ باورچی خانے ہی میں جان

ہار گئی۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اکیس رے میں تحقیق کی وجہ سے پہلے ہی بیمار تھا۔ اب ایک پیچیدہ ترین شکل میں "ایٹمی بیماری" نے بھی اپنے اثرات کا اضافہ کر دیا۔ اس پر مستزاد دائیں جانب کا زخم تھا۔ ان سب نے مل کر مجھے مکمل طور پہ ناکارہ کر دیا اور ایک غیر معمولی خوش قسمتی کے بارے میں بھی سن لیجیے کہ دھماکے سے تین دن پہلے میں نے دونوں بچے پہاڑوں میں ان کی دادی کے پاس بھیج دیے تھے۔ اس طرح وہ محفوظ اور تن درست رہے۔

"ایٹمی بیماری" میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد مبتلا تھی۔ اس آفت کے گوناگوں آثار سامنے آتے چلے گئے۔ یکے بعد دیگرے انسان موت کے گھاٹ اترتے چلے گئے، ان چیزوں کا تصور ہی میرے لیے جاں کاہ تھا اور میں ہر قسم کے منصوبے باندھتا رہا، صرف اس لیے کہ ان مصائب سے توجہ ہٹ جائے۔ اس سے پہلے مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا سائنس داں کا کام بھی اتنا دردناک بوجھ بن سکتا ہے۔ میرے جسم پہ زخم تھے۔ ان کی وجہ سے میری نقل و حرکت میں رکاوٹیں آتی تھیں۔ اس کے باوجود میں نے چھڑی ہاتھ میں لی اور بڑی کوشش سے پہاڑوں پر چڑھتا رہا۔ دریاؤں کو پھلانگتا رہا تاکہ اپنے مریضوں تک پہنچ سکوں۔ میں نے یہ کام دو مہینے تک جاری رکھا، لیکن اس کے بعد مجھ پہ ایٹمی بیماری کا ایک ایسا شدید حملہ ہوا کہ مجھے اپنا طبّی کام مکمّل طور پر چھوڑنا پڑا۔

بعد میں . . . . اب مجھے لوگوں سے کہنا پڑتا ہے کہ اس مسودے کے کاغذات ایک ایک کر کے مجھے دیں۔ اب مجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی کہ خرد بین سے بھی کوئی چیز جانچ سکوں۔ خوش قسمتی سے میں اپنی تحقیق کا مقصد خود اپنے جسم میں رکھتا ہوں۔

جب ہیروشیما اور ناگاساکی پر پہلے بم گرے تھے تو ساری دنیا سکتے میں آگئی۔ سچ پوچھیے تو میرے خیال میں جن لوگوں نے بم باری کے بارے میں صرف سُنا ہی تھا انھیں ہم لوگوں کے مقابلے میں جو براہِ راست اس حملے سے متاثر ہوئے تھے زیادہ سخت صدمہ اور سکتہ ہوا۔ لوگوں کو اچانک معلوم ہوا کہ کسی بڑے شہر کو چند لمحوں میں خاکستر کیا جا سکتا ہے۔ انھیں ایسی خبر کے لیے پہلے سے تیار نہیں کیا گیا تھا، اس لیے زیادہ بھونچکا پن کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے۔

اگر ایسا ہتھیار مستقبل میں بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا تو انسانی نسل ہی نہیں، پوری تہذیب کے مقدّر میں نیست و نابود ہونا ہی لکھا ہے۔

ہم میں سے جن لوگوں نے بم باری سے تکلیف اٹھائی انھیں یہ تصوّر تک نہیں تھا کہ ایٹم بم کیسی تباہی لا سکتا ہے۔ مجھے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ بم اتنا قیامت خیز ثابت ہوگا حال آنکہ میں اُس وقت ایٹمی کھمبی نما بادل کے بالکل نیچے تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ محض ایک سُپر بم ہے یا اسی قسم کی کوئی چیز ہے لیکن جب بادل چھٹ گیا اور بالکل منتشر ہو گیا اور سُورج کی جو روشنی اس نے چُھپا رکھی تھی، وہ چھَن چھَن کر آنے لگی اور میں کچھ دیکھنے کے قابل ہو سکا، تو اس وقت میں نے اِدھر اُدھر نظر ڈال کر اپنے آپ سے کہا، "یہ تو دنیا کا خاتمہ ہے"۔

اور باقی دنیا خوف سے چلّا اٹھی، "اب ایٹم بم کبھی استعمال نہیں ہونا چاہیے"۔

اس کے باوجود میں سُنتا ہوں کہ بعض لوگ اس بم کو نہ اتنا خوف ناک سمجھتے ہیں اور نہ یہ رائے رکھتے ہیں کہ ایسے بم کو کسی حالت میں بھی استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں "کوئی شہر مکمّل طور پر برباد نہیں ہوتا۔ کچھ نہ کچھ لوگ ضرور بچ جاتے ہیں... تابکاری وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غائب ہو جاتی ہے.... یہ محض ایک نیا ہتھیار ہے۔ پہلے استعمال کیے ہوئے ہتھیاروں سے زیادہ مؤثر..."

محض زیادہ مؤثر؟ جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ کیا جانیں کہ کیسی قیامت گزر گئی؟

تاکاشی ناگائی

[ڈاکٹر تاکاشی ناگائی ایٹم بم کے دھماکے کے اثرات سے ۱۹۵۱ء میں انتقال کر گئے]

ہیروشیما سے خط

از تامیکی ھارا

[جو ۱۹۰۵ء میں ہیروشیما میں پیدا ہوا]

ہیروشیما، اگست ۱۹۴۵ء۔

میں ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو صبح آٹھ بجے بستر سے اٹھا۔ گزشتہ شام دو بار ہوائی حملے

کے خطرے کا الارم ہوا، لیکن کوئی بم نہ گرائے گئے۔

اچانک میرے سر پر زور کا دھچکا لگا اور میری آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو گئی۔ ایک گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی۔ میں چلّایا اور میں نے اپنی دونوں بانہیں، بازو پھیلائے۔ اس تاریکی میں اگر کچھ سنائی دیتا تھا تو ایک ایسی آواز جسے آپ ایک بہت بڑے طوفان کی گرج سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ میں سمجھ نہ سکا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میری اپنی چیخ بھی کسی اور کی چیخ معلوم ہوتی تھی۔

پھر آس پاس کی چیزیں نظر آنے لگیں، لیکن ابتدا میں وہ واضح نہیں تھیں۔ اب میں محسوس کرنے لگا کہ میں کسی بہت بڑی آفت کا سامنا کر رہا ہوں۔ مٹی کے گہرے بادلوں کے پیچھے سے نیلگوں آسماں کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا، اور اس کے فوراً بعد اور ٹکڑے بھی نمودار ہو گئے۔

ساتھ کی عمارت سے چھوٹے چھوٹے شعلے لپکنے لگے۔ یہ فارمیسی کی مصنوعات کا ایک گودام تھا۔ اب یہاں سے ہٹ جانا ہی ضروری تھا۔ میں "کے" کے ساتھ ملبے کے ڈھیروں سے راستہ بناتا نکل گیا۔

مکانوں کے کھنڈروں سے دھوئیں کے موج در موج بادل اُٹھ رہے تھے۔ ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں شعلوں کی تپش ناقابلِ برداشت تھی اور پھر ہم ایک اور گلی میں ہو لیے جو ہمیں سکائی کے پُل کی طرف لے جاتی تھی۔ وہاں پناہ گزینوں کے ہجوم مسلسل بڑھ رہے تھے یں قصرِ ازدمی کی طرف چلنے لگا۔ بھاگنے والے لوگوں کے پاؤں تلے روندی جانے والی جھاڑیوں سے ایک قسم کا راستہ بن چکا تھا۔ قریب قریب ہر درخت ٹوٹ کر گر چکا تھا۔

پہلے ہر شخص نے یہی سمجھا کہ صرف اُسی کا گھر بم کا نشانہ بنا ہے، لیکن جونہی کوئی باہر آیا تو اس وقت سے معلوم ہوا کہ ہر چیز برباد ہو چکی ہے۔ اور ہاں اگرچہ ہر عمارت زمین بوس ہو چکی تھی، لیکن اُن گڑھوں کا کوئی نام نشان نہیں تھا جو عام طور پر بم گرنے سے بن جاتے ہیں۔ دریا کے دوسرے کنارے پر جو آگ بہ ظاہر بجھ رہی تھی، اس میں سے شعلے پھر اُٹھے اور وہ بھی پہلے سے کہیں زیادہ شدّت کے ساتھ۔

اچانک دریا کے اُوپر آسمان پر کیا دیکھتا ہوں کہ غیر معمولی طور پر شفّاف ہوا کی ایک بڑی سی آندھی دریا کے دھارے کے مخالف رُخ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں ابھی طوفان، طوفان پکارنے ہی والا تھا کہ ایک خوف ناک آندھی نے آلیا۔ جھاڑیاں اور درخت پاگلوں کی طرح

کانپنے لگے بعض جڑ سے اکھڑ گئے اور ہوا میں اچھلے اور نیچے جہاں ہول ناک افراتفری کا عالم تھا، وہاں تیروں کی طرح گرے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ زمین پر کسی خوف ناک جہنّم کی شکل وصورت مسلّط کی جارہی تھی۔

جب آندھی گزر گئی تو ایک لمحے بعد آسمان کو ایک شفق نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ عیلن اس وقت میں اپنے بڑے بھائی سے ملا۔ اُس کا چہرہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس پر خاکستری رنگ کی ایک پتلی سی تہ جمی ہوئی ہے۔ اُس کی قمیض کا پچھلا حصہ پارہ پارہ ہوچکا تھا اور ان دھجیوں میں سے ایک بہت بڑا زخم نظر آرہا تھا۔ جو دھوپ سے جلے ہوئے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔

دریا کے کنارے تنگ پشتے کے ساتھ ساتھ جب ہم کشتی کی تلاش میں نکلے تو بہت سے ایسے افراد دیکھے جن کی صورتیں مکمّل طور پر مسخ ہوچکی تھیں۔ وہ دریا کے ساتھ ساتھ ہر جگہ تھے۔ پانی کے پس منظر میں ان کے سیاہ سائے سے نظر آتے تھے۔ ان کے چہرے اتنے مہیب انداز میں سُوجے ہوئے تھے کہ مردوں کو عورتوں سے ممیّز کرنا مشکل تھا۔ ان کی آنکھیں محض درزیں معلوم ہوتی تھیں اور ہونٹ انتہائی عجیب طور پر سُوجے ہوئے تھے۔ وہ قریب قریب سب مر رہے تھے اور اُن کے زخمی جسم کپڑوں سے محروم تھے۔ جب ہم بعض لوگوں کے پاس سے گزرے تو کچھ نے بڑی کمزور آواز میں جو مشکل سے سُنی جاتی تھی، کہا: "مجھے تھوڑا سا پانی دو۔ مہربانی کرو اور میری مدد کرو۔"

ایک دردناک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ایک نوجوان کا عُریاں جسم دریا میں پڑا تھا اور اس سے چند فیٹ دُور سیڑھیوں پر دو عورتیں گٹھڑی ہو کر پڑی تھیں۔ اُن کے سر سوجن سے ڈیڑھ گنا ہو چکے تھے۔ ان کے نقوش قابلِ رحم حد تک مسخ تھے۔ صرف اُن کے آدھے جلے ہوئے لمبے بالوں سے مَیں نے پہچان لیا کہ وہ عورتیں ہیں۔

آخر ہمیں ایک چھوٹی کشتی مل گئی اور ہم اُسے کھیتے کھیتے دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ اس وقت شام ہوچکی تھی۔ دریا کے اُس کنارے پر بھی بہت سے لوگ زخمی تھے۔ ایک سپاہی کنارے پر بیٹھا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا، "مجھے تھوڑا سا گرم پانی دو۔" اس کے بعد وہ میرے کندھے کا سہارا لے کر بڑی مشکل اور درد سے کراہتے ہوئے ریت پر چلتا گیا اور پھر اچانک بول اٹھا، "اس سے تو اچھا تھا ہم مر جاتے۔" میں نے خاموشی کے ساتھ اس سے اتفاق کیا اور اس لمحے ہم نے ایک لفظ کا تبادلہ بھی نہ کیا، لیکن میں جانتا تھا کہ ہم دونوں اپنے

اردگرد کی حالت کے پاگل پن پر ایک ایک ایسے غصّے کا شکار تھے، جس پر قابو پانا بہت مشکل تھا۔

ایک شخص میز کے پاس بیٹھا چائے کی پیالی سے گرم پانی پی رہا تھا۔ اس کا سر بہت زیادہ سُوجا ہوا تھا اور اس پر زخم ہی زخم تھے۔ اُس کا چہرہ اتنا سیاہ تھا جیسے سویا کے بیج۔ اس کے بال کان کی سطح پر بالکل سیدھے کٹے ہوئے تھے۔ بعد میں جب میں نے آبلوں کے مزید مریض دیکھے تو ان کے بال بھی ایسے ہی تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اُن کی ٹوپیوں کے کناروں کے نیچے سب کچھ جل چکا ہے۔

رات پڑی تو یہ منظر زیادہ جہنمی بن گیا۔ ہر طرف لوگ پانی پانی پکارتے تھے۔

اچانک ہوائی حملے کا الارم ہوا۔ شاید کہیں کوئی سائرن تباہ ہونے سے بچ گیا تھا۔ اس سائرن کی چیخ نے رات کا سنّاٹا توڑ دیا۔ دریا کے بہاؤ کی جانب شعلوں کی چمک بتا رہی تھی کہ شہر کا کون سا حصّہ جل رہا ہے۔

معبدوں کے علاقے میں زمین پر ہر جگہ وہ زخمی پڑے تھے جن کی حالت خراب تھی۔ وہاں نہ کوئی درخت تھا نہ خیمہ، جو انھیں سایہ مہیا کرتا۔ ہم نے بعض کمزور سے بورڈوں کو ایک دیوار کے ساتھ اُڑاکر کر ایک چھت سی بنالی اور رینگ کر اُس کے نیچے چلے گئے۔ چوبیس گھنٹے تک اس چھوٹی سی جگہ میں ہم چھے افراد پڑے رہے۔ دو میٹر دور شیری کا ایک درخت کھڑا تھا۔ جس میں کچھ پتے ابھی تک موجود تھے۔

ایک درخت کھڑا تھا، جس میں کچھ پتے ابھی تک موجود تھے۔ اس درخت کے نیچے اسکول کی دو لڑکیاں گری پڑی تھیں۔ اُن کے چہرے جلے ہوئے تھے اور سیاہ تھے اور اُن کی مریل سی کمریں دھوپ کا شکار تھیں۔ انھوں نے تھوڑا سا پانی مانگا۔ وہ ابھی ایک دن پہلے فصلوں کی کٹائی میں مدد دینے کو ہیروشیما آئی تھیں اور یوں اس ہولناک قیامت میں سے گزرنے والوں میں دو افراد کا اضافہ ہوگیا۔

سورج اب غروب ہو رہا تھا . . . .

سورج نکلنے سے پہلے بھی ہم اپنے اردگرد دعاؤں کی آوازیں سُن رہے تھے۔ یہاں لوگ یکے بعد دیگرے مر رہے تھے۔ سورج نکلتے ہی وہ دو اسکول کی لڑکیاں بھی جان ہار بیٹھیں۔

دوپہر کے قریب پھر ہوائی حملے کا الارم ہوا۔ آسمان پر ایک بھنبھناتی سی آواز آئی۔ لوگ مرتے چلے گئے اور کوئی لاشوں کو اٹھانے نہ آیا۔ اور جو زندہ تھے۔ وہ مجبور اور بدحواس کیفیت میں مُردوں کے درمیان میں آوارہ پھر رہے تھے۔

اب ہم بڑے بڑے برباد بازار دیکھ سکتے تھے۔ اوپر سیسے کے رنگ کا آسمان، اس کے نیچے دُور تک پھیلی ہوئی خاکستری دھرتی۔ صرف بازار، پُل اور دریا کی شاخیں اب بھی پہچانی جاسکتی تھیں اور

ان سب کے درمیان خوف ناک، مسخ شدہ اور سوجی ہوئی نعشیں۔ یہاں جہنم ایک حقیقت بن گیا تھا۔
ہر انسانی چیز مٹ چکی تھی۔ سب مُردوں کے چہرے یکساں تھے معلوم ہوتا تھا جیسے سب نے ایک ہی بہروپ لے رکھا ہے۔ درد سے اعضا تشنج کا شکار ہوتے تھے اور وہ بھی عجیب و غریب حرکت کے انداز میں، اور پھر جسم موت کا شکار ہو کر اکڑ جاتے تھے۔ میلوں لمبے بجلی کے تار اور کھمبوں کے ٹکڑے عجیب شکل میں مُڑے تُڑے اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ ایک ٹرام اچانک پل بھر میں اور بالکل جل چکی تھی۔ ایک مُردہ گھوڑا نظر آیا، سوجن کا شکار، یہ سب چیزیں ایسا تاثر دیتی تھیں جیسے ہم کسی فوقِ حقیقت تصویر کے اجزا ہیں۔

ہم برباد ویرانوں سے گزرے جن کا کوئی انت نہیں معلوم ہوتا تھا۔ گرے ہوئے مکانوں کی ایک قطار تھی۔ جو بیرونی بستیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ کوساٹسُو کے مقام سے گزرے تو کچھ سبزہ نظر آیا یعنی وہ دیہاتی علاقہ جو کسی بربادی سے متاثر نہیں تھا۔ دھان کی سرسبز کھیتیوں پر پرندوں کی آزادانہ اور خوب صورت پرواز سے جی خوش ہو گیا اور آنکھوں میں تراوت آگئی۔ پھر ہم اس لمبی اور اکتا دینے والی سڑک پر ہو لیے جو یاواتا کے گاؤں کو جاتی تھی۔ وہاں ہم رات کے وقت پہنچے۔ صبح کے وقت ہمیں پھر اپنی بدبختی سے سابقہ پڑا۔ نہ صرف زخمیوں کی حالت میں کوئی بہتری پیدا نہیں ہوتی تھی بلکہ جو لوگ زخمی نہیں ہوئے تھے، وہ بھی روز بروز کمزور ہو رہے تھے کیوں کہ انھیں خوراک نہیں مل رہی تھی۔
کچھ دن بعد میں نے اسکول کا ایک لڑکا آتے دیکھا۔ وہ میرا بھتیجا تھا، جسے بعد میں زخموں کی وجہ سے موت کا شکار ہونا پڑا۔ جس وقت بم پھٹا وہ اسکول میں تھا اور جب خیرہ کن چمک سے فضا روشن ہوئی تو وہ ڈیسک کے نیچے دبک گیا اس پر اوپر سے چھت گر گئی اور وہ دفن ہو گیا، لیکن وہ اپنے بعض ہم جماعتوں کی مدد سے ایک سوراخ یا شگاف کے ذریعہ باہر نکل آیا۔ زیادہ تر بچے چشم زدن میں مر گئے۔ میرا بھتیجا اپنے دوستوں کے ساتھ ہجی کی پہاڑی کو بھاگا۔ وہ جوں جوں پہاڑی پر چڑھتا گیا کسی سفید سیّال چیز کی قے کرتا رہا۔ گاؤں میں وہ بالکل گنجا ہو گیا۔ یہ افواہ پہلے ہی پھیل چکی تھی کہ جس زخمی کے بال گر جاتے ہیں اور نکسیر پھوٹتی ہے وہ زندہ نہیں بچتا۔ اس کے باوجود میرا بھتیجا کافی عرصے زندہ رہا حالانکہ اس کی حالت بڑی نازک تھی....

شام کے وقت، میں نے پل کو پار کیا اور کھیتوں میں سے گزرتا اس طرف بڑھا جہاں دریائے یاواتا کے کنارے پر مٹی کا بند بنا ہوا تھا۔ ایک چٹان پر ایک کالا پرندہ اپنے پر خشک کر رہا تھا میں نے وہاں غسل کیا اور اپنے پھیپھڑوں کو تازہ ہوا سے خوب تازہ دم کیا۔ اس وقت پہاڑ کا دامن شام کی

شفق میں غائب تھا، لیکن دُور کی پہاڑی چوٹیاں غروب ہوتے ہوئے آفتاب سے چمک رہی تھیں۔
یہ منظر کیا تھا، ایک خواب تھا میرے اوپر آسمان چپ چاپ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے میں ایٹم بم
پھٹنے کے بعد ہی اس دنیا میں آیا ہوں۔

تامیکی ھارا

[۱۹۴۵ء میں ایٹمی تاب کاری سے متاثر تامیکی ہارا نے ۱۹۵۱ء میں خودکشی کر لی۔]

ضمیمہ ج
جیمز تھوربر
آخری پھول

یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے ۔ دوسری عالمی جنگ میں دنیا کے جھونکے جانے سے ذرا پہلے ــــ امریکی مزاح نگار جیمز تھوربر نے "آخری پھول" چھاپی، جو جنگ اور امن کے موضوع پر ایک تصویری حکایت تھی۔ ایٹم بم کی آمد اور دنیا کو برباد کرنے کی انسان کی موجودہ صلاحیت کی روشنی میں، آج تھوربر کا یہ فن پارہ زیادہ گہرائی اور زیادہ معنی کا حامل ہو گیا ہے اور یہ ایک ایسے انداز میں تخفیفِ اسلحہ کی ضرورت پر زور دیتا ہے جیسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ کتاب سب سے پہلے ہارپر اینڈ برادرز نیویارک نے چھاپی تھی اور اس کا انتساب یوں کیا گیا تھا "روز میری کے نام، اس امید میں کہ اس کی دنیا میری دنیا سے بہتر ہو گی۔"

جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ بارھویں عالمی جنگ نے تہذیب کو ختم کر دیا۔
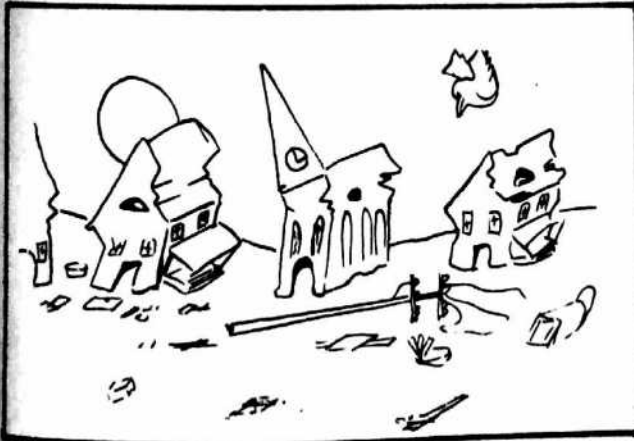
اس دھرتی سے شہر، قصبے اور دیہات نابود ہو گئے۔

تمام باغات اور جنگلات برباد ہو گئے - - -
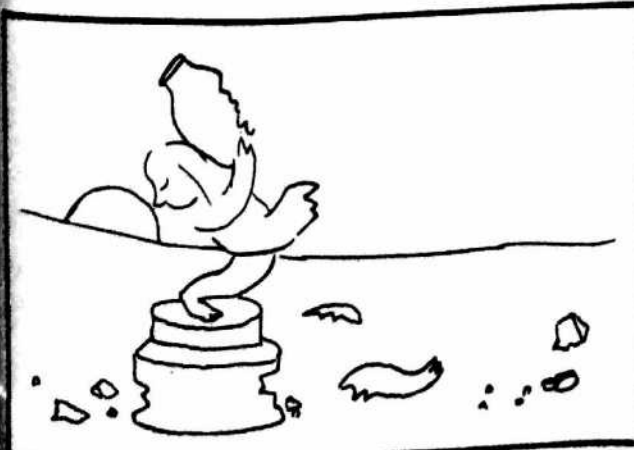
- - - - اور فن پارے بھی
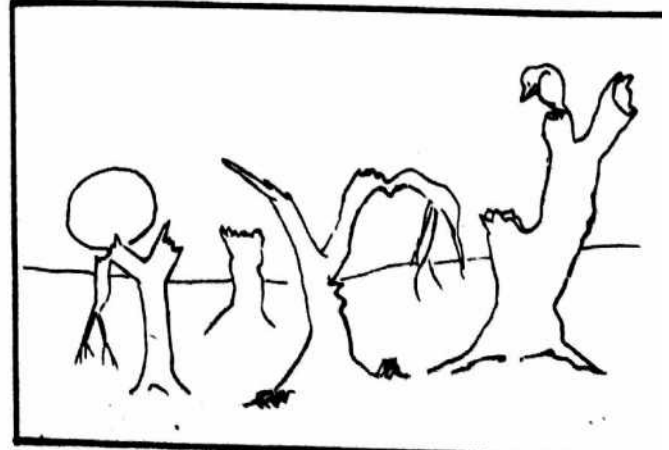
مرد، عورتیں اور بچے ادنا ترین جانوروں سے بھی ادنا ہو گئے۔

حوصلہ ہار کر اور پریشان ہو کر کتوں نے زوال میں مبتلا اپنے آقاؤں کو چھوڑ دیا۔

دھرتی کے سابق آقاؤں کی اس قابلِ رحم حالت سے جرات پاکر خرگوش بھی اُن کے پیچھے پڑ گئے۔

سال ہا سال گزرتے چلے گئے۔

لڑکے اور لڑکیاں بڑے ہو کر ایک دوسرے کو خالی نظروں سے گھورتے تھے کہ محبت دھرتی سے اُٹھ چکی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک لڑکی نے زمین پر آخری پھول دیکھا اس نے اپنی زندگی میں کبھی پھول نہیں دیکھا تھا۔
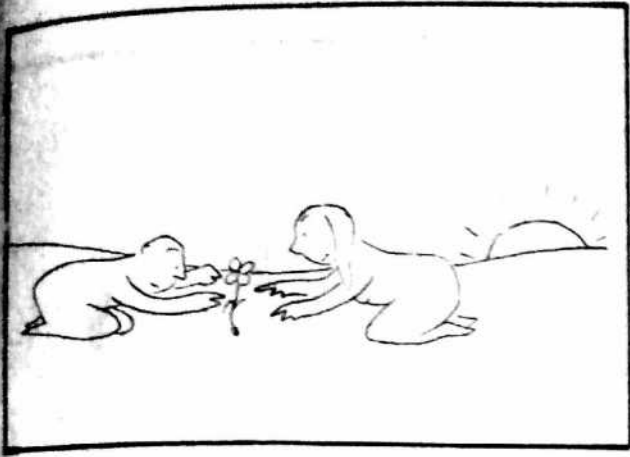
اس نے دوسرے انسانوں سے کہا کہ دھرتی کا پھول مُرجھا رہا ہے۔
صرف ایک نوجوان نے اُس کی بات پر دھیان دیا۔
نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکی نے مل کر اس پھول
کی نگہداشت کی اور وہ پھر شگفتہ ہوگیا۔
پہلے دو پھول ہوئے، پھر چار ہوئے اور پھر بہت سے
پھول اُگے۔
پھر سے درختوں کے جھنڈ اور جنگل پھلنے پھولنے
لگے۔
محبّت نے دنیا میں پھر جنم لیا
کتے جلاوطنی سے لوٹ آئے۔
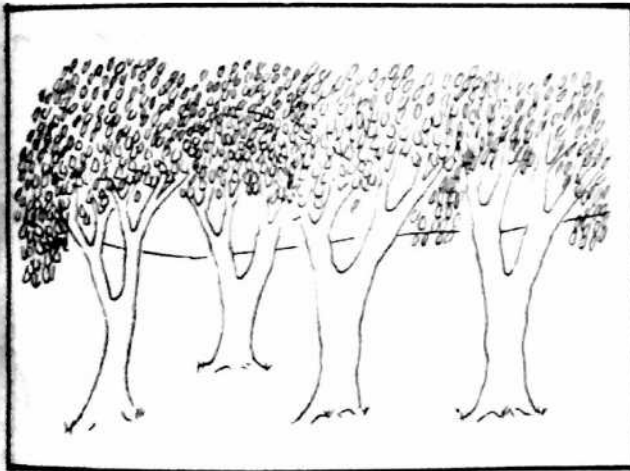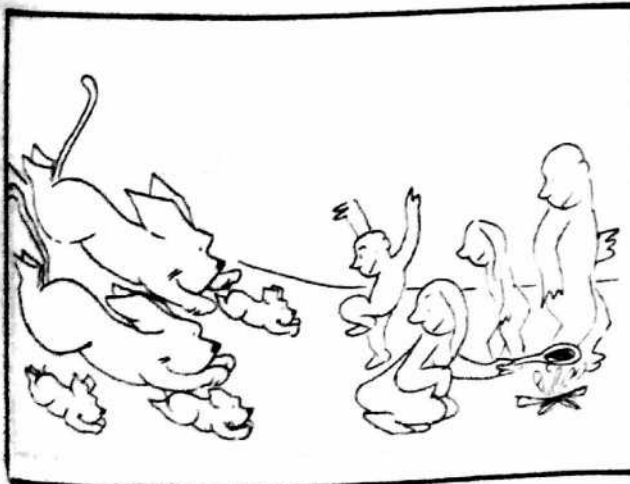
قصبے، شہر اور دیہات پھر اُبھر آئے

موسیقار اور تماشا دکھانے والے دنیا میں واپس آگئے۔
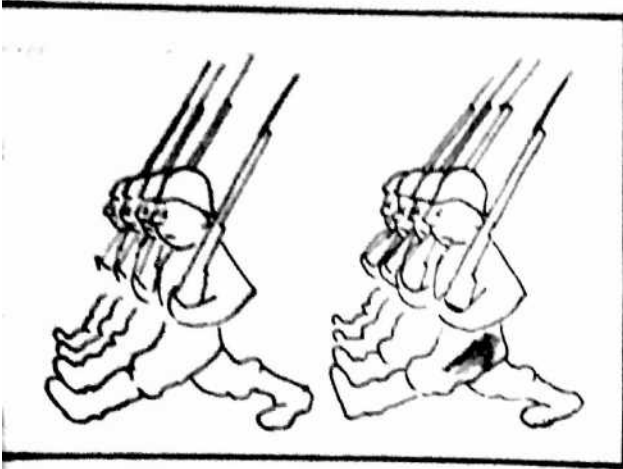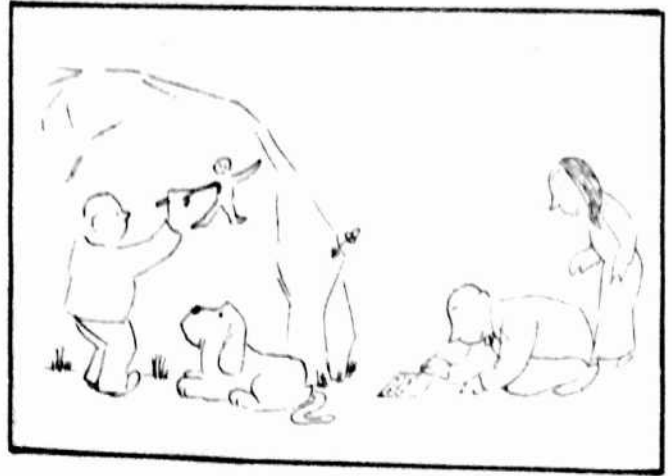
اور مصوّر اور شاعر بھی

اور سپاہی بھی

اور ان پر مستزاد اور سپاہی بھی
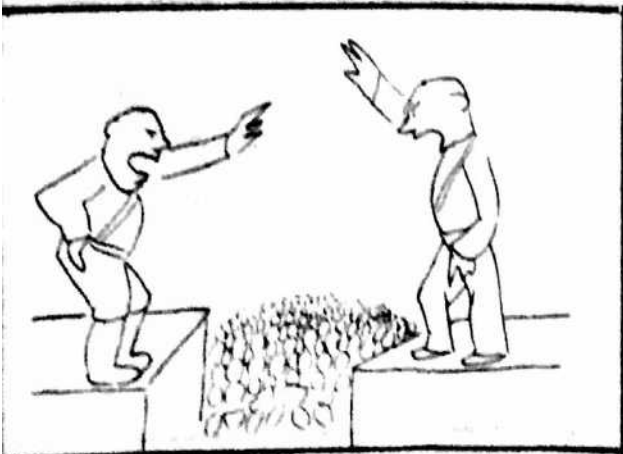
آزادی دلانے والوں نے بے اطمینانی کے شعلوں کو ہوا دی۔
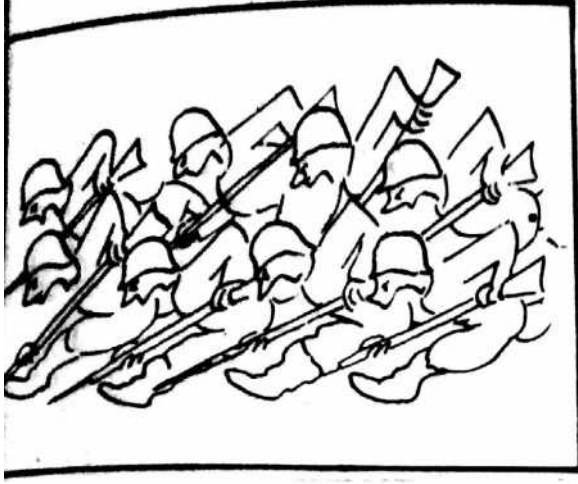
اس دفعہ بربادی اتنی مکمل تھی۔۔۔
پس دنیا میں پھر جنگ ہوئی
سوائے ایک انسان کے
۔۔۔کہ دنیا میں کچھ بھی باقی نہ رہا۔
اور ایک پھول کے
اور ایک عورت کے
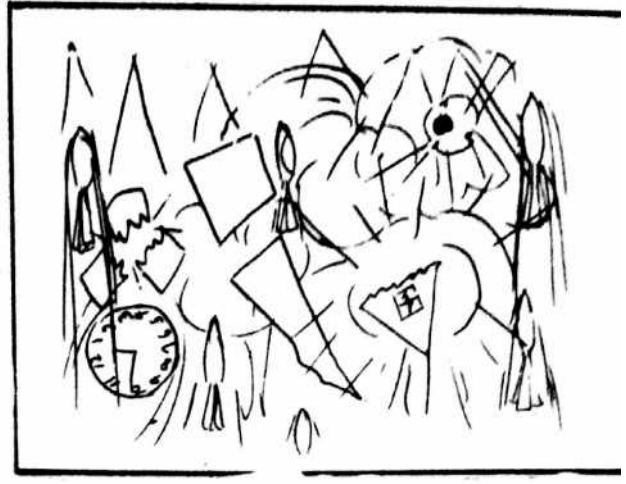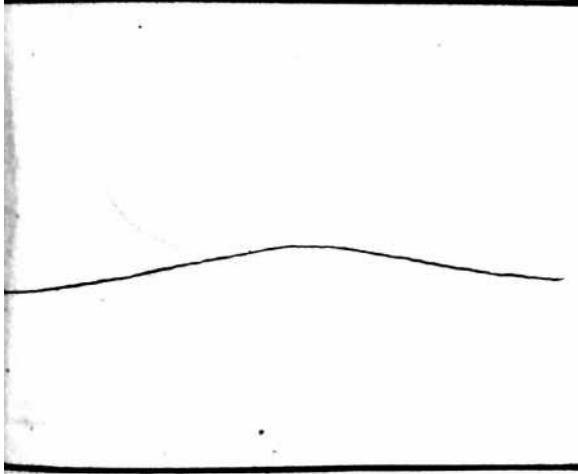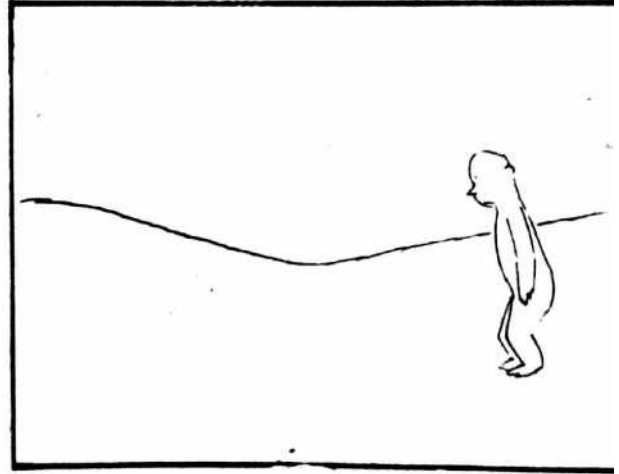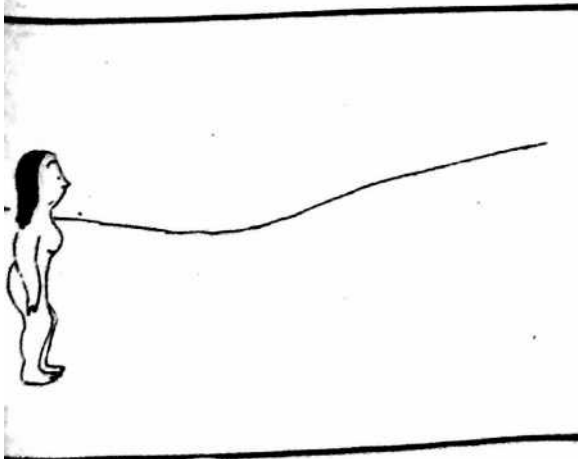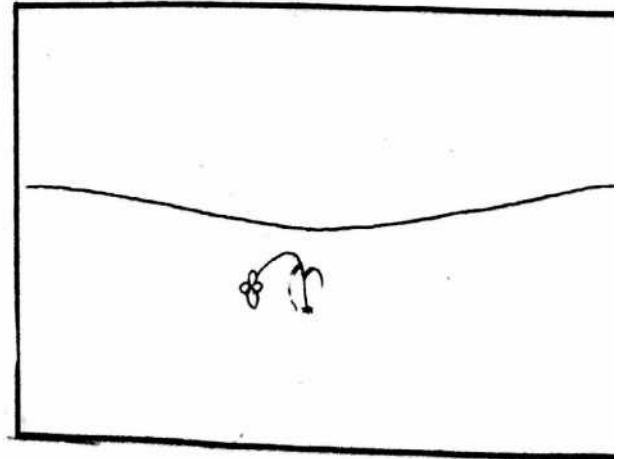
انسان اور امن
جنگ اور سیاست کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ حالیہ میں یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ جنگ جیسے
نازک معاملے کو فوجی قائدین پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کئی فوجی قائدین کی یہ ہے کہ امن کا مسئلہ
نازک ہے اور اسے غیر فوجی شہریوں پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ حقیقت یہ عام لوگوں نے —— جو جنگ کا ہمیشہ
شکار رہتے ہیں —— اسے ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس لیے آج کل عالمی امن کے خوش گوار
امکانات موجود ہیں۔ اس کتاب میں بعض مسائل کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے مثلاً کیا جارحیت انسان کی
سرشت میں داخل ہے، نیز ان مسائل کی بنا پر جو غلط فہمی اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔
یونیسکو کے دستور کے مطابق کرۂ ارض کے امن اور ترقی کی بنیاد نوع انسان کے ذہنی اور اخلاقی اتحاد پر
رکھنی چاہیے۔ یونیسکو نے کئی شعبوں میں اس نصب العین پر عمل کیا ہے مثلاً آثاریات، ابلاغ عامہ و
مواصلات، تعلیم، مختلف قسم کے فنونِ لطیفہ، ماحولیات اور بحریات۔ دوسرے لفظوں میں اس نے علم کی
تخلیق، اس کے تحفظ اور نشر و اشاعت میں کام کیا ہے۔ اس عظیم اور اہم ترین کام میں یونیسکو کوریئر نے کہ جو
آج کل دنیا کی ۲۶ زبانوں میں ہے، محوری کردار ادا کیا ہے۔
یونیسکو کوریئر کے لکھنے خصوصی اس ماہ نامے کے مقالات
معروضی، مستند اور ہوتے ہیں اور انھیں یک جا کر کے پڑھنے سے قاری کے ذہن میں عالمی مسائل کی ایک
جامع تصویر ابھرتی ہے پیپر بیک جس میں ان مقالات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ ان میں بعض مسائل کی جامع
اور فکر انگیز تصویر پیش کی ہے اور ان جو آج کی دنیا کے شہریوں کو درپیش ہیں۔
ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی